جلد ۱۴۶ ماہ صفر المظفر سنہ ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۹۰ء عدد ۳

مضامین

شذرات

آٹھ برس تک ہونے والی عراق اور ایران جنگ کے زخم ابھی ہرے ہی تھے کہ کویت میں عراق کی فوجی کارروائی سے پھر مشرق وسطیٰ میں جنگ کے آثار نظر آنے لگے ہیں، کویت پر قبضہ اور عراق سے اس کے الحاق کے بعد سعودی عرب بھی عراق سے خطرہ محسوس کرنے لگا تھا جس کے دفاع کے لیے اسے امریکی فوجوں کو بلانا پڑا، عراقی جارحیت اور کویت کے انضمام کی کارروائی کی پوری دنیا میں مذمت کی جارہی ہے، جن ملکوں پر اس کو بھروسہ تھا وہ بھی کھل کر کویت پر اس کے قبضے کو غلط کہہ رہے ہیں، ایرانی صدر بلا تاخیر اس سے کویت کو خالی کردینے کا مطالبہ کرچکے ہیں، اور عراق کے وزیر خارجہ نے اس معاملہ میں روس کے اختلاف کا اعتراف کیا ہے، سوویٹ یونین کے سربراہ گورباچوف عراقی جارحیت کو برداشت نہ کیے جانے پر امریکی صدر جارج بش سے متفق ہیں، دونوں نے اپنے مشترکہ بیان میں پھر عراق سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر کویت سے چلا جائے اور اس کی جائز حکومت کو بحال کردے۔

دوسری طرف بعض غیر جانبدار ملکوں میں خصوصاً مسلمانوں میں عراق کے خلاف امریکہ کے اقدامات اور اس کو الگ تھلگ کردینے کی کوششوں اور سلامتی کونسل کی عائد کردہ پابندیوں پر بڑی برہمی پائی جاتی ہے، بالخصوص سعودی عرب میں امریکی فوجوں کا داخلہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت ہوگیا ہے، ان کو رہ رہ کر یہ خیال ہو رہا ہے کہ آخر امریکہ کیوں اس قدر سعودی عرب کا ہمدرد ہوگیا ہے، وہ سمجھ رہے ہیں کہ در اصل امریکہ مشرق وسطیٰ کو تباہ اور عربوں کو دو نیم کرکے اسرائیل کو مضبوط کرنا چاہتا ہے، اگر واقعی اس کو عربوں سے ہمدردی ہوتی تو اس نے ان کے علاقوں کو اسرائیل سے خالی کرانے میں بھی اسی طرح تگ و دو کی ہوتی، اس کو عربوں کے بجائے اسرائیل کا تحفظ اور اپنا مفاد عزیز ہے، وہ عرصہ سے اسی فکر میں تھا، اب

اس کا اچھا موقع مل گیا ہے، مسلمان ابھی تک تو بیت المقدس چھن جانے ہی کا ماتم کر رہے تھے اور اب ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل — خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

لیکن مشرق وسطیٰ کے موجودہ حالات کے لیے سب سے زیادہ ذمہ دار خود عراق ہے، جس کی فوجیں کویت پر قبضہ کرکے سعودی عرب کی سرحد پر جمع ہوگئی ہیں، اس نے باہمی گفت و شنید کے سارے دروازے بند کردیے اور پُرامن سمجھوتہ اور خلیج کے بحران کو دور کرنے کی ہر کوشش ناکام بنادی، اس پر نہ عربوں کی کوئی اپیل کارگر ہوئی اور نہ اس نے سلامتی کونسل کی قرارداد کی پروا کی، ایران سے جنگ بندی کے معاملہ میں بھی اس نے اسی طرح کی ضد اور ہٹ دھرمی دکھائی تھی، اب اسے اسرائیل کا غم کھا رہا ہے، لیکن اس کا ٹکراؤ سعودی عرب سے ہے جو اس کی اور پی. ایل. او کی برابر مدد کرتا رہا ہے جس نے اپنی فوجی قوت نہ بڑھا کر عربوں کے تحفظ اور فلسطین کی آزادی کے لیے اس کو جدید طرز کے اسلحے سے مسلح کیا تھا، اسے کیا پتہ تھا کہ اس کے ہتھیار خود اسی کے خلاف استعمال ہوں گے، کیا اسرائیل کو شکست دینے کا یہی طریقہ ہے؟ اور کیا عربوں سے لڑ بھڑ کر عراق زمانہ میں پنپ سکتا ہے؟۔

عراق کے صدر صدام حسین کو اس وقت اسلام کی یاد آئی ہے اور انھوں نے جہاد کا نعرہ بڑے زور و شور سے لگایا ہے، مگر اس کا رخ اسلام کے دشمنوں کے بجائے اپنے ہی بھائیوں اور ہم مذہبوں کی جانب ہے، آٹھ برس تک ایران میں داد شجاعت دینے سے جب ان کو تسلی نہیں ہوئی تو انھوں نے بیت اللہ کے متولیوں اور محافظوں کو اپنا نشانہ بنایا ہے، جو حرمین شریفین کی خدمت و توسیع، سرزمین حجاز کی تعمیر و ترقی اور حجاج کو راحت و سہولت فراہم کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں، جن کے خزانے اعلائے کلمۃ اللہ اور کفر و باطل کی سرکوبی کے لیے ہمیشہ کھلے رہے، جنھوں نے دولت توحید و سنت کے فروغ و احیاء، اسلام کی سربلندی و اشاعت اور

شرک و بدعت کے رد و استیصال کے لیے مسلسل وقف رہی اور جنھوں نے برابر مسلمانوں اور ان کی حکومتوں کی مالی و اخلاقی امداد کی ہے، صدام حسین تو کسی شمار و قطار میں نہیں اور نہ ان کے عقیدہ و نظریہ سے بحث ہی ہے، دنیا کا کوئی مسلمان ملک اسلامی جمیت اور ملی اتحاد کی جدوجہد میں مملکت سعودیہ کا حریف نہیں، اس وقت عراق کو اپنی توسیع پسندی سے باز آکر عربوں سے اپنا اختلاف باہمی گفت و شنید سے طے کرلینا چاہیے تاکہ اسرائیل اور اس کے سرپرستوں کی خوشی پر پانی پھر جائے۔

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو ؛ ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے ؛ نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

۱۱ر اگست ۱۹۹۰ء کو وزارت فلاح عامہ کی جانب سے دہلی میں اقلیتوں کی بہبود کے بارے میں ان کے لیڈروں اور دانشوروں کی ایک قومی کانفرنس ہوئی، وزیر محنت رام ولاس پاسوان کے علاوہ وزیر اعظم وی۔ پی۔ سنگھ، وزیر داخلہ مفتی محمد سعید اور راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیرمین نجمہ ہبۃ اللہ بھی اس میں شریک ہوئیں، وزیر اعظم نے اقلیتوں کی جان و مال کی طرح ان کے عقیدہ و مذہب اور تہذیب و زبان کی حفاظت پر زور دیتے ہوئے انھیں ملک کے اقتدار اور نظم و نسق میں شریک کیے جانے کی ضرورت بتائی، اور کہا کہ ان کے ساتھ غیریت کا برتاؤ کرنے اور انھیں الگ تھلگ کر دینے سے ملک کمزور ہوگا، بابری مسجد، اقلیتی کمیشن کو قانونی درجہ دیے جانے اور فسادات کی روک تھام وغیرہ کے بارے میں اپنی حکومت کے عزائم بتاتے ہوئے انھوں نے یقین دلایا کہ ان کی نیت اور ارادہ مضبوط ہے، بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اقلیتوں سے ہمدردی ہے اور وہ واقعی ان کے دکھ درد کو دور کرنا چاہتے ہیں، اقلیتوں کے نمایندوں کی باتوں کو وزیر اعظم اور ان کے ساتھیوں نے توجہ اور تحمل سے سنا اور اہم باتیں نوٹ کیں، خوشی ہوئی کہ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ کسی حکومت نے مسلمانوں کے مسائل کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

مقالات

قدسی الہ آبادی اور نعت قدسی

از

جناب کالی داس گپتا رضا۔ بمبئی

قدسی الہ آبادی کے خاندانی حالات اور شیخ محمد افضل الہ آبادی

غازی پور کے قریب ایک قصبہ سید پور ہے، شیخ محمد افضل الہ آبادی ۱۰۳۸ھ میں ۱۰ر ربیع الاول کی شب (۲۴ر اکتوبر ۱۶۲۸ء) کو وہیں پیدا ہوئے تھے، شروع میں قاضی محمد آصف اور مولانا نور الدین جعفر جونپوری اور دیگر علماء سے تحصیل علم کی اور فضائل رسمی میں عالی مرتبہ حاصل کیا، پھر پچیس [۲۵] سال کی عمر میں حضرت میر سید محمد کالپوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے، اور یہ مقام پایا کہ اپنے مرشد کے خلفاء کے سرتاج کہلائے، بعد ازاں اپنے پیر کے اشارے سے مستقل طور پر الہ آباد میں سکونت اختیار کرلی اور "تلقین اصحاب و تعلیم آداب" میں مشغول ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے قبول خاص و عام عطا فرمایا، آخر کار لمبی عمر پاکر ۵ر ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ بروز جمعہ (۲ر جنوری ۱۷۱۳ء) الہ آباد ہی میں انتقال کیا۔

شیخ کے بھتیجے اور داماد شیخ خوب اللہ

شیخ محمد افضل کے انتقال کے بعد ان کے سگے بھتیجے اور داماد شیخ خوب اللہ (جن کا اصلی نام شیخ محمد یحییٰ تھا) سجادہ نشین ہوئے، وہ "علوم شریعت و طریقت" کے بحر مواج تھے، اور بارہ ہی سال کی عمر میں چچا (شیخ محمد افضل) کی تربیت نے انھیں کندن بنا دیا تھا، اسی لیے نامور چچا کی رحلت کے بعد ان ہی کو ان کا نائب

بنایا گیا، انھوں نے بہت سی کتابیں اور رسالے تصنیف کیے، ۱۱ رجمادی الاولیٰ سنہ ۱۱۴۴ھ کی رات (۳۱ راکتوبر ۱۷۳۱ء) کو انتقال کیا اور اپنے عم بزرگوار شیخ محمد افضل کے پہلو میں دفن ہوئے۔

شیخ خوب اللہ کے تین بیٹے تھے (۱) شیخ محمد طاہر (۲) شیخ محمد ناصر افضلی اور (۳) شیخ محمد فاخر زائر، علم وفضل، شریعت وطریقت میں تینوں کا رتبہ بلند تھا، تاہم جانشین پدر محمد فاخر زائر قرار پائے، زائر ۱۱۲۰ھ (۹-۱۷۰۸ء) میں پیدا ہوئے تھے، سال ولادت "خورشید" سے نکلتا ہے، ان کے دادا (دادا کے بھائی) شیخ محمد افضل نے انھیں دوسرے بھائی شیخ محمد ناصر افضلی کی طرح چھوٹی ہی عمر میں اپنا مرید کر لیا تھا، اور دونوں نے تعلیم اپنے والد بزرگوار شیخ خوب اللہ اور بڑے بھائی شیخ محمد طاہر سے پائی۔

شیخ محمد ناصر افضلی | شیخ محمد ناصر افضلی کا انتقال یکم جمادی الاولیٰ سنہ ۱۱۶۳ھ (۲۸ رمارچ ۱۷۵۰ء) کو ہوا، شیخ اسد اللہ غالب جو شیخ محمد افضل کے نواسے اور افضلی کے خالہ زاد بھائی تھے، کا انتقال بھی اسی سال سنہ ۱۱۶۳ھ میں ہوا تھا، چنانچہ آزاد بلگرامی فرماتے ہیں ؎

افضلی شیخ کامل و غالب　　　آرمیدند در ریاض ارم
سالِ تاریخ گفت غمزدۂ　　　آہ رفتند ہر دو زیب عالم
۱۱۶۳ھ

افضلی کا ذہن بہت رسا تھا، شعر بہت تیزی سے کہتے تھے، صاحب دیوان تھے، چند شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

صفای خاطر روشن دلاں ہمیں سخن است　　　چو صبح صافی آئینہ ام ز دم زدن است
زاہد از خلوت نشینی فکر صید عام کرد　　　چوں نگیں در حلقۂ خود را از برائے نام کرد
سخنور چوں بمیرد شعر او مشہور تر گردد　　　کہ صافی تر کند گردِ یتیمی آبِ گوہر را
لب گزیدۂ اغیار را چہ بوسہ زنم　　　عقیق کندۂ نام دگر چہ کار آید

تذکرہ "سروِ آزاد" (سال تالیف سنہ ۱۱۶۶ھ = ۵۳-۱۷۵۲ء) کے مصنف میر غلام علی آزاد کا اس گھرانے سے گہرا ربط تھا، اور وہ (سال ولادت سنہ ۱۱۱۶ھ) شیخ محمد فاخر زائر کے ہم عصر بھی تھے، انھوں نے اپنے تذکرہ میں اس خاندان کے حالات، شیخ خوب اللہ کی اولاد تک، تفصیل سے دیے ہیں۔

شیخ محمد فاخر زائر | شیخ محمد فاخر زائر دو دفعہ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے، تیسری بار ارادہ دکن میں اپنے دوست آزاد بلگرامی سے مل کر حرمین شریفین جانے کا تھا کہ برہان پور پہونچ کر بیمار پڑ گئے اور ۱۱ رذی الحجہ سنہ ۱۱۶۴ھ (۲۰ راکتوبر ۱۷۵۱ء) کو انتقال کیا، سال ولادت "خورشید" سے نکلا تھا اور سال وفات "زوال خورشید" سے برآمد ہوا، عمر چوالیس[۴۴] سال تھی، وصیت کے مطابق برہان پور ہی میں شیخ عبد اللطیف کے مزار کے پاس دفن ہوئے، زائر صاحب دیوان تھے، چند اشعار یہ ہیں:

بباغِ عاشقی از میوہ و گل نیست سامانے　　　کنم بادام و نرگس را فدائے چشم گریانے
آئینہ باصفائے رخت رو گرفتہ است　　　گل پیش آں دہن، دہن بو گرفتہ است
دارم دلے کہ بر دم تیغ ست راہِ او　　　مژگان چشم یار بود سیرگاہِ او
بر میاں بر زدہ دامان ز کجا می آئی　　　مرحبا گر بشکار دلِ ما می آئی
حبِ دنیا می فریبد خاطرِ افسردہ را　　　گوشمالی می دہد روباہ شیرِ مردہ را
مور را در خمِ زلف تو بہ بیند بارے　　　عینکِ داغِ دلم از چہ کلاں بین شدہ است
مرا ز آمد و رفت نفس روشن شد ایں معنی　　　کہ اقبالِ جہاں در دم زدن ادباری گردد
دنیا عزیز کردۂ دنیا طلب بود　　　از التفات شوی بود قدر زن بلند
کنند گور پرستاں زیارتِ زاہد　　　کہ زیر گنبد دستار زندہ در گور است

بعد مردن تیز بادم نیست بر دوش کسے　　　ما بجو رنگِ گُل عدم بیمائیم از پرواز خویش

در گلستانی کہ مارنگِ تماشا ریختیم　　　آسماں یک بال بر ہم خوردۂ طاؤس بود

رُباعی

تا پیروِ چار یار اخیار نہٗ　　　از چار اصول دین خبر دار نہٗ

در طبعِ تو ایں چہار عنصر باہم　　　تا ہست باعتدال بیمار نہٗ

رباعی

گر تن بہ بلاہائے قضا نتواں داد　　　از کف سر رشتہ رضا نتواں داد

در ہر چہ نشد مگو چنیں بایستے　　　تعلیم خدائی بخدا نتواں داد[۱]

می رسد یک زخمِ او در جملۂ اعضائے ما　　　تیر او چوں خوں رود در کوچہ دلہائے ما

سدّ مقصود است خلعتہائے سلطانی[۲] مرا　　　دام دیدار است چوں آئینہ عریانی مرا

شیخ محمد فاخر زائر کے بڑے بیٹے غلام قطب الدین

شیخ محمد فاخر زائرؔ کے دو[۳] صاحبزادوں کی خبر ملتی ہے، بڑے شیخ غلام قطب الدین اور چھوٹے شیخ محمد اجمل، غلام قطب الدین یکم محرم ۱۱۳۸ھ (مطابق ۲۹ اگست ۱۷۲۵ء) کو پیدا ہوئے، کمال اپنے والد سے حاصل کیا، اپنے والد ہی کے ہاتھ پر بیعت تھے، درسی اور ادبی استعداد زبردست تھی، تذکرۂ بے نظیر (۱۷۵۸ء) میں لکھا ہے کہ ان دنوں الہ آباد سے "بہ طریقِ سیر" بنگال کی طرف گئے ہیں، والد کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے، ۱۱۸۶ھ کے ماہ شعبان کے عشرۂ اول میں زیارت حرمین شریفین کے لیے بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر نکل پڑے، جب بیت اللہ پہونچے تو حج کے دن نہ تھے، چنانچہ

۱؎ یہاں تک کے تمام حالات مع اشعار میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرۂ "سرو آزاد" سے اخذ کیے گئے ہیں۔
۲؎ یہ دو شعر "تذکرۂ بے نظیر" سے لیے گئے ہیں۔　　۳؎ تذکرہ روز روشن

مدینے چلے گئے، جب حج کا زمانہ قریب آیا تو واپس ہوئے، مگر راستے ہی میں مرض اسہال میں گرفتار ہو کر آخر ماہِ ذیقعدہ ۱۱۸۷ھ (فروری ۱۷۷۴ء) میں انتقال کیا، اور مکہ معظمہ میں دفن ہوئے، ۴۹ سال کی عمر پائی۔

شیخ غلام قطب الدین شاعر تھے اور مصیبؔ تخلص کرتے تھے، چند شعر یہ ہیں:

ز بلبل باغباں بے مروت سرگراں دارد　　　کہ ایں بے خانماں ماتم چرا در گلستاں دارد

گاہ در بت کدہ، گاہے بہ حرم سیر کند　　　یار غارت گر دین است، خدا خیر کند

شبہا بہ کوئے یار گذر می کنیم ما　　　از سر چو شمع قطع نظر می کنیم ما

بنشینم دیہ پای گلی نوحہ سر کنم　　　فرصت اگر دہد بہ چمن باغباں مرا

من از مو بافیٔ مشاطۂ او سخت حیرانم　　　کہ دست آموز خود یا رب چساں کرد است مارا

از عسل برخرمن زنبور برق افتد مصیبؔ　　　موجب تشویش دل گردید شان ما بہ ما

مردیم و ہنوز بر لبِ من　　　چو شمع فسردہ دود آہ است[۱]

شب فراق بیادت ز دیدۂ تر ما　　　کدام چشمہ کہ طوفاں نہ کرد بر سر ما

تکمۂ پیراہنِ گلگوں قبائے دیدہ است　　　از خجالت دیدہ ام سر در گریباں غنچہ را

ندارد نکتۂ برجستہ ای چوں بیت ابرویش　　　بامعان نظر دیدیم دیوانِ ہلالی را

سبو بدوش بہ بزم بت یگانہ بیا　　　بگو کہ بادہ فروشم بدیں بہانہ بیا

بر زباں رفت بشی نام گلستاں ما را　　　چنگ از ناز زدہ خار بیاباں ما را

در حلقہ حلقۂ خود صد دل نگار دارد　　　یکسر ہزار سودا گیسوئے یار دارد

نہ دامانش بکف داریم و نے بر زلف او دستی　　　بدرت بیدلی دستی بدست آرزو دستی[۲]

۱؎ یہ سات شعر تذکرۂ بے نظیر سے لیے گئے۔ ۲؎ یہ سات شعر تذکرۂ روز روشن سے لیے گئے۔

موت خواہی نہ خواہی آمدنی است
اے خوش آنکہ کو مکی مدنی است

کسی نے بلبلو، تم سے بہار کو دیکھا
دے آنکھیں کون سی تھیں جن سے یار کو دیکھا

ہزار وعدے کیے ایک بھی وفا نہ کیا
تمھارے قول کو دیکھا، قرار کو دیکھا

جو روتے روتے مری آنکھ لگ گئی تھی شب
بہت دنوں کے اوپر خواب یار کو دیکھا

جو آنکھیں کھل گئیں بیکل وہی اکیلا تھا
وہی خزاں اور اسی خار خار کو دیکھا

کون گلشن میں کہو مشک کی بو لاتی ہے
کہتے ہیں زلف کے کوچے میں صبا جاتی ہے

سر تیک صبح کرے ہے شب ہجراں کو مصیب
کس طرح رات کو ظالم تجھے نیند آتی ہے

تیرے گلے کا ہار ہوں یوں چاہتا ہے دل
اس پیرہن کا تار ہوں یوں چاہتا ہے دل

ہے مجھے شاہِ نجف سیتی شفاعت کی امید
سخت عصیاں سیتی گر روزِ قیامت ہوگا

میٹھی باتوں پہ شکر لب کے نہ دے دل کو مصیب
اب تو لگتا ہے بھلا پھیر یہ آفت ہوگا[1]

سیاہ بخت کے گھر کون ہے جو لائے چراغ
مرے مزار پر جلتا ہے دل بجائے چراغ

شکل کو یہو نچے اس صفِ مژگاں میں دل مصیب
کیونکر سپاہی جائے فرنگی کی باڑھ میں

شیخ زائر کے چھوٹے بیٹے شیخ محمد اجمل

شیخ غلام قطب الدین مصیب کے انتقال (فروری سنہ ١٧٧٤ء) کے بعد ان کے چھوٹے بھائی محمد اجمل سجادہ نشین مقرر ہوئے، اور شاہ اجمل کے نام سے مشہور ہوئے، یہاں امر اللہ مولف تذکرہ مسرت افزا کا بیان درج کیا جاتا ہے، جسے اس لیے ترجیح ہے کہ وہ الٰہ آباد میں شاہ اجمل اور ان کے خانوادے سے بہت قریب تھے، تذکرۂ مسرت افزا میں شاہ اجمل کا ترجمہ یوں ہے:

"ابو الفضل ناصر الدین محمد سلمہ اللہ تعالیٰ خلف الصدق حضرت شاہ محمد ناصر افضلی خلف حضرت

[1] یہ دسوں شعر تذکرہ مسرت افزا سے ماخوذ ہیں۔

شاہ خوب اللہ الٰہ آبادی قدس سرہما، ان کا اسم شریف اجمل محمدی مشہور ہے، اجمل تخلص کرتے ہیں، صاحب فضل و کمال ہیں، اور بہت بڑے بزرگ و شیخ، خدا تعالیٰ نے ان کو شروع جوانی ہی میں ظاہری اور باطنی صفات سے آراستہ کر دیا، اور ان کے کمال کے بقدر جمال بھی عطا کی، ان کے والد بزرگوار نے ان کے بچپن ہی میں وفات پائی تھی، انھوں نے اپنے بھائی قطب العارفین شاہ غلام قطب الدین[1] الٰہ آبادی (خدا ان کی قبر کو نورانی کرے) کے زیر سایہ تربیت حاصل کی، علوم درسی کی کتابیں مولانا محمد نصیح جون پوری سے پڑھیں، البتہ علوم باطنی اور اشغالِ تصوف اپنے برادر بزرگوار سے حاصل کیے، جب ان کے برادر بزرگوار حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا، اس وقت وہ اپنی خاندانی مسند پر بیٹھے اور سجادہ نشین ہوئے، ان کی عمر مبارک بتیس (٣٢) سال سے زیادہ نہیں، چنانچہ ایک دن ان کے ایک دوست ان کی تاریخ ولادت معلوم کر رہے تھے، بہ طریق انبساط فرمایا کہ "خورشیدم"[2]۔ جب حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ یہی ان کا سال ولادت ہے، یہ خدا کی عنایت ہے کہ علوم ظاہری و باطنی میں جس قدر ان کا مرتبہ بلند ہے، شعر و شاعری میں بھی ان کا درجہ اسی قدر بلند ہے، ان کے کہے ہوئے ریختے کے یہ چند شعر مجھے یاد تھے جو لکھے جاتے ہیں:

[1] شاہ اجمل کے بڑے بھائی (یا عم زادے) غلام قطب الدین، شاہ اجمل سے ٢٣ سال بڑے تھے، اس سے بھی شبہہ ہوتا ہے کہ شاہ اجمل، شیخ محمد فاخر زائر کے نہیں، بلکہ ان کے بھائی شیخ محمد ناصر افضلی کے بیٹے تھے۔ [2] شیخ محمد فاخر زائر کا سال ولادت "خورشید" سے نکلتا ہے (١١٢٠ھ) چنانچہ اسی پر ٤١ اعداد یعنی ام بڑھا کر شاہ اجمل نے اپنا سالِ ولادت "خورشید ام" (خورشیدم غلط ہے) کہہ دیا۔ شاہ اجمل کا سال ولادت ١١٦١ھ ہے۔

نہ پوچھو مجھ سے کہ تیرا کہاں بسیرا ہے　　تمام رات ہے اور اس گلی کا پھیرا ہے

عشق پھیرا اپنے پر لیا تو نے　　ہائے اے دل یہ کیا کیا تو نے

کیوں ہوتے نہیں ہو وا ہوا کیا　　سچ کہیو ذرا بھلا ہوا کیا

خوش لگتے تھے ہنستے بولتے تم　　اب رہتے ہو کیوں خفا، ہوا کیا

کچھ خیر نظر نہیں ہے آتی　　مائل کہیں دل ترا ہوا کیا

جس بات پہ ہم کو ہنستے تھے تم　　درپیش وہ ماجرا ہوا کیا

اجمل مرنے کو میرے سن کر　　بولا وہ سنا بھلا ہوا کیا

کس بے دلی سے ہائے کٹی یہ تمام رات　　ایدھر سے تھا سوال ادھر سے جواب تھا

رُباعی

معلوم نہیں دل کو ستایا کن نے　　اس آبلے کو ہائے دکھایا کن نے

چھوٹا تھا خیالِ عشق مدت سے　　پھر فتنۂ خوابیدہ جگایا کن نے

ٹک واسطے خدا کے اے خواب مت مخل ہو　　پائی ہے وصل کی شب ہم نے خدا خدا کر

میں دیکھ آنکھوں میں طوفان خوں ہوا حیراں　　گر کر ٹوٹ گیا میرا آبلہ دِل کا

نہ نالہ ہے، نہ فغاں ہے، نہ آہ حسرت ناک　　کدھر گیا نہیں معلوم قافلہ دل کا

آنسو تھمتے مرے نہیں تھمتے　　کس طرح کی جھڑی لگی اللہ

رباعی

کیا کیجئے اپنا حال کس سے کہیے　　کوئی نہیں دادرس کہ جس سے کہیے

کر قطع امید اب سبھوں سے اجمل　　کہلاتے ہیں جس کسی کے اس سے کہیے

رُباعی

جا کر اس در پہ جبہ سائی کیجے　　اور خوب سی اس سے آشنائی کیجے

کیا بات اگر وہ اپنی باتوں پہ لگے　　اجمل واللہ پھر خدائی کیجے

رباعی

پھرنا موہوم پر بہر سو کب تک　　بے ہودہ تلاش اور تگاپو کب تک

آنے کا نہیں ہاتھ وہ زنہار اجمل　　جوں فاختہ بے فائدہ کو کو کب تک

تذکرۂ نگارستان سخن میں اجمل اور فاخر مکیں کے ایک معرکہ اور مقابلہ کا ذکر ہے لکھا ہے کہ اجمل نے یہ رباعی (حقیقت میں قطعہ) اسی دوران میں کہی تھی ؎

خورشید دشم بیم شب تار ندارم　　آئینۂ صبحم غمِ زنگار ندارم

آئینہ نمط درستِ کوراں منم اجمل　　غم نیست اگر گرمیٔ بازار ندارم

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ شاہ اجمل نے ۱۱۹۶ھ (۸۲-۱۷۸۱ء) میں چند اشعار الہ آباد سے راقم تذکرہ کو بنارس بھیجے تھے، شاہ اجمل کی ولادت ۱۱ شوال ۱۱۶۱ھ کو رات میں ہوئی تھی اور وفات[1] یکم ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ کو، (یعنی ولادت مطابق ۲۳ ستمبر ۱۷۴۸ء اور وفات مطابق ۳۰ اگست ۱۸۲۱ء)

مولف گلزار ابراہیم کو بھیجے ہوئے اشعار میں سے دو شعر یہ ہیں:

شاد تھا دل سب طرف سے بر میں جب جانانہ تھا ؎ ہائے کیسی رات تھی جس رات وہ مہمانہ تھا

ہو گیا تھا کہتے کہتے ان دنوں میں ہوشیار ؎ پھر جو دیکھا کل میں اجمل کو وہی دیوانہ تھا

درج ذیل اشعار تذکرہ روز روشن سے ہیں۔

---

[1] تذکرۂ روز روشن۔

بود خموشی حیرت ترانۂ دلِ ما
رسد چگونہ بگوشش فسانۂ دلِ ما

اقلیم دل بعشق تو ویرانہ گشتہ است
آئینہ خانہ بود پری خانہ گشتہ است

آمدم از عدم و طرفہ تماشا دیدم
روئے نادیدنی مردم دنیا دیدم

شیخ علی حزیں نے (شاید چوٹ کرتے ہوئے) یہ رباعی خود شاہ اجمل کو بھیجی ؎

دیدیم سواد ہند حیرت زار است
روزے کہ دمد چو شامِ ہجراں تار است

بستہ است بکار ہمہ شان سخت گرہ
اینجا گرہ کشادہ در شلوار است

مگر جواب میں شاہ اجمل نے یہ رباعی لکھ کر شیخ کو لاجواب کر دیا ؎

صبح طرب ہند چو روئے یار است
شامِ خوشِ او چو کاکل دلدار است

اینجاست کشادہ صد ہزاراں در فیض
جز یک گرہے کہ بستہ در شلوار است

تذکرہ مسرت افزا کے مولف لکھتے ہیں کہ

"غلام قطب الدین مصیب کے انتقال پر ان کے چچازاد بھائی شاہ اجمل نے
ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ اس طرح کہا ؎

مرشد و استاذ من شاہ غلام قطب الدین
رفت بمکہ از وطن سوئے خدائے خود شتافت

سالِ وفات او طلب اجمل خستہ دل نمود
ہاتف غیب من بگفت قطب زماں وفات یافت
۱۱۸۷ھ

دیگر متفرق اشعار جو مختلف تذکروں میں پائے گئے یہ ہیں :- ؎

ہو گیا خونِ ناب آنکھوں میں
تھا جہاں تک کہ آب آنکھوں میں

شب فرقت میں تیری اے ظالم
ہو گیا خواب خواب آنکھوں میں

ہنوز آں سوزش عشق است در زیر غبار من
کہ دود سینہ باشد سایہ گستر بر مزار من

گہے سر بر سر سنگم گہے سنگے بسر دارم
بہ شبہائے فراقش نیست دیگر کار و بار من

بسیر آں جہاں من ہم سر و برگ سفر دارم
عزیزاں اند کے باید کشیدن انتظار من

زبس در زندگی دامن کشاں رفتی ز من یارے
گرفت آخر ز بعد مرگ داما نت غبار من

بہ ایں امید در کویش نشستہ عمرہا اجمل
کہ شاید ہمرہِ طفلاں برآید نے سوارِ من

شاہ اجمل کے صاحبزادے شاہ ابوالمعالی

شاہ اجمل کی وفات (۳۰ اگست ۱۸۲۱ء) کے بعد غالباً ان کے صاحبزادے شاہ ابوالمعالی عالی سجادہ نشین ہوئے، یہ بھی ارباب فضل و کمال و اصحاب حال و قال" میں سے تھے، ۱۱۹۶ھ (۸۲ - ۱۷۸۱ء) میں پیدا ہوئے تھے، درسی کتابیں آخوند محمد سلطان پوری سے پڑھیں، اصلاح سخن فارسی میں اپنے والد شاہ اجمل سے اور اردو میں میر تقی میر سے لی، ۱۰ ربیع الآخر ۱۲۵۲ھ (۲۱ اگست ۱۸۳۶ء) کو انتقال کیا، "تذکرۂ شوکت نادری میں لکھا ہے کہ "شاعروں کے علامہ ہیں اور غزل گو شعراء کے امام، ذیل کے اشعار تذکرہ روز روشن سے ہیں ؎

رفتی ز پہلوئے من و غم شد قریں مرا
دشمن بجائے دوست بود ہمنشیں مرا

خط سبز تو غارت می کند جان جہانی را
عجب دارم کہ گرد د خضر رہزن کاروانی را

تو غافل ماندہ ای افتادہ بر ساحل چہ می دانی
کہ دارد در بغل ہر قطرہ بحر بیکرانی را

برنگ غنچہ من امشب گرفتہ دل بودم
نسیم وعدۂ فردا شگفتہ کرد مرا

بیاد رویت از کون و مکاں برداشتم دل را
ز من برداشتی دل از جہاں برداشتم دل را

بوقت خیر بادت دل ز ہوش افتاد و میدیدی
کہ چوں تابوت بر دوشِ فغاں برداشتم دل را

بہ ابروئے تو دل من مقابل افتادست
چہ خون گرفتہ بشمشیر مائل افتادست

رقیب دشمن و دل دشمن و فلک دشمن
بگوی دوست مرا سخت مشکل افتادست

دولت فقرست سلیمانیم — ننگ بود شاہی و سلطانیم

بہر لباسم بمقام فنا — بس بود ایں جامۂ عریانیم

میروم از دیر بعزم حرم — کافرم و گرم مسلمانیم

بردہ ای از دلم قرار عشوہ گرا تو کیستی — راست بگو جفا شعار بہر خدا تو کیستی

چوں نہ کنم ز رشک تو جامۂ خویش را قبا — بر کمرش گرہ زدی بندِ قبا تو کیستی

تو چہ دانی ای بت بی خبر چہ بود ترا خبر کسی — کہ بیاد زلف و رخ کسی شدہ شامِ غم سحر کسی

من و آہ و نالۂ جاں گزا تو و ناز عشوہ گری ترا — نہ خیال چشم تر کسی نہ خبر ز دود سرِ کسی

تذکرۂ نادر سے اشعار ؎

صبح کز خون جگر باشد لبالب جام ما — در گرفت از دست ساقی عشق خوں آشامِ ما

طفلی ما تا بہ پیری در جہاں یکساں گزشت — ہیچ فرقے نیست از آغاز تا انجامِ ما

دام از بخت بد امواج دریا می شود — گر بیفتد از قضا یک ماہی در دامِ ما

دور گردوں کے تواند گشت ما را با مراد — چرخ گوید الاماں از گردشِ ایامِ ما

حالیا از تلخیٔ ناکامی ما نیست غم
از درود مصطفےٰ گردید شیریں کام ما

تذکرۂ شوکت نادری سے ؎

طاقِ حرم چوں خمِ ابروئے تست — مصحف ناطق صحف روئے تست

خالِ سیہ دانہ پے صیدِ دل — دام بلا حلقۂ گیسوئے تست

عنبر اشہب خطِ مشکیں رقم — مشک ختن زلف سمن بوئے تست

قامتِ تو کرد قیامت بپا — فتنۂ محشر قدِ دلجوئے تست

عالی مژدہ بدہ احباب خویش — منتظر لعل سخن گوئے تست

غلام اعظم پسر شاہ ابوالمعالی | شاہ ابوالمعالی کے ایک صاحبزادے کی خبر ملتی ہے، ان کا نام غلام اعظم (یا محمد افضل) تھا، تذکرۂ روز روشن میں قاضی اختر کے حوالے سے لکھا ہے کہ شاہ غلام اعظم کی، جن کا تخلص افضل تھا' ولادت ۲۴ ذی القعدہ ۱۲۲۵ھ (۲۲ دسمبر ۱۸۱۰ء) کو ہوئی تھی، افضل نے فیض باطنی اپنے خاندان سے پایا، اور علوم عربیہ مولوی سید زین العابدین سے حاصل کیے، نہایت خوبصورت آدمی تھے، تذکرۂ صبح گلشن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور (پنجاب) میں بس گئے تھے، لکھا ہے کہ "از اکمل اولیائے لاہور است" یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ ناصر علی سرہندی افضل کو معنی آفریں شاعروں میں شمار کرتے تھے، اور یہ شعر انھیں بہت پسند تھا ؎

نوشتم نامہ از فریاد دل برپا قیامت شد — نمی دانم قلم یا صور محشر بود در دستم

ناسخ کے شاگرد تھے، یہ ۲ شعر تذکرہ روز روشن سے ماخوذ ہیں:

خون گرمی ست از رخت امشب شراب را — گویا فشردہ اند بجام آفتاب را

ہست مطلوب تو موجود عجب جائے ہست — در دل خویش نظر کن کہ تماشائی ہست

اور یہ ۲ شعر تذکرۂ شوکت نادری سے ؎

جلوہ در باغ چو آں خوش قد و بالا می کرد — قمری از شاخچۂ سرو تماشا می کرد

گرچہ سودائے سر زلفِ تو می پوشیدم — لیکن ایں نامۂ زنجیر تو رسوا می کرد

تذکرۂ نادر اور دوسرے تذکروں سے ۲ شعر اور ملاحظہ کیجئے:

جینے نہیں دیتی ہے ذرا چاہ کسی کی — آئے مجھے آئی ہو جو اللہ کسی کی

فرقت میں اگر نالے رہیں گے یہی ہر دم — جی لے گی مرا الفت جانکاہ کسی کی

پھوٹیں مری آنکھیں جو کسی اور کو دیکھوں   ناحق نہ ستا کیجیے ناقرار کسی کی

جی جائے جگر ٹکڑے ہو پھٹ جائے کلیجہ   کیا تجھ کو خبر اے بت گمراہ کسی کی

جب سے کہ ترے نورِ رخِ صاف کو دیکھا   خواہش نہیں اے رشکِ دہ ماہ کسی کی

افضلؔ تو غلامی میں ہے یا سید کونین   پروا سے ہرگز نہیں یا شاہ کسی کی

ہے یقیں نورِ بصارت ہو زیادہ افضلؔ   سرمۂ خاکِ مدینہ لگے گر آنکھوں میں

معلوم ہوتا ہے تکمیل تذکرۂ روزِ روشن (۱۲۹۶ھ = ۷۹-۱۸۷۸ء) تک بقید حیات تھے[1]۔

شاہ علی جعفر | شاہ ابوالمعالی عالیؔ (متوفی ۱۸۳۶ء) کی ایک ہمشیرہ (شاہ اجملؔ کی بڑی صاحبزادی) شاہ علی جعفر (نبیرۂ شاہ غلام قطب الدین، خلف شاہ علی رضا) کے عقد میں تھیں، جعفر نہ صرف ارباب عرفان و کمال میں سے تھے، بلکہ ایک اچھے شاعر بھی تھے، انھوں نے ۱۲۴۹ھ (۳۴-۱۸۳۳ء) میں انتقال کیا۔

تذکرۂ شوکت نادری میں درج ہے کہ "پہلے اچھی طرح فکر شعر کیا کرتے تھے، لیکن اب (۱۸۳۱ء) کاموں کی زیادتی سے بہت کم اتفاق ہوتا ہے۔"

یہ تین شعر تذکرۂ روزِ روشن سے ہیں:

بوصف رخسار و قامت از نوک کلکم چہ نقش نزد   خدنگ یا ورد احمر ست ایں قدست یا سرو گلشن آرا

وصال ممکن بزندگی کو؟ دلے یقیں شد کہ بعد مردن   صبا رساند بکوئے آں ماہ مشت خاکی ز تربت ما

در جمال تو چہا اے بت زیبا دیدم   روئے گل بوئے سمن خوئے مسیحا دیدم

یہ پانچ شعر تذکرۂ نادر سے ہیں:

---

[1] درج بالا کے علاوہ قدسی کی ننھیال میں اور بھی شعراء تھے جیسے شاہ علیم اللہ (محمد علیم) حیرت د بیتاب، پسند احمد خاں کامل، غلام حیدر حیدر وغیرہ اس موضوع کا براہ راست ان سے کوئی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے میں نے انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔

لبانت آتشے زد خرمن جانہائے محزوں را   دہانت تنگ کردہ غنچۂ دلہائے پرخوں را

دہد از کوئے او بر باد خاکم گرد باد آسا   نمی دانم چرا با ما عداوت ہاست گردوں را

بیا از پیشِ من بردار ایں کحل صفاہانی   ز خاک پائے لیلا سرمہ باشد چشم مجنوں را

بیا د زخمی آں تیر مژگاں را تماشا کن   کہ می آرد چساں بیروں ز دل فوارۂ خوں را

ز کلکت چوں جرس در دہر جعفرؔ شور افتادست   نمک سود از تبسم کردہ ہر لفظ و مضموں را

اور یہ ۵ شعر تذکرہ شوکت نادری سے:

خوشتر اندم کہ ترا صحبت من عار نبود   میل خاطر زنیت جانب اغیار نبود

ایں زماں مدعی عشق تو ہستند بسے   پیش ازیں کس چو منت عاشقِ غمخوار نہ بود

پیش ازیں غیر من اے عشوہ فروش عالم   عشوہ و ناز ترا ہیچ خریدار نہ بود

باعث شہرۂ حسن تو شدم من ورنہ   ایں قدر حسن ترا گرمیٔ بازار نہ بود

دوش در بزم طرب چوں نہ رسیدم جعفرؔ   ہمہ بودند وراں مجمع بے یار نہ بود

شاہ علی جعفر کے کم از کم دو بیٹوں کا پتہ چلتا ہے، ایک شاہ علی کبیر[1] عرف سید میرن جان

---

[1] تذکرۂ روزِ روشن اور شوکت نادری۔ مگر تذکرۃ المعاصرین از نساخ میں درج ہے "سید علی اکبر شاہ میرن جان بن سید علی جعفر، شاہ محمد اجمل الہ آبادی کے نواسے ہیں" لیکن یہ سہو ہے، کیونکہ سید علی اکبر قدسیؔ کے بیٹے اور سید علی جعفر کے پوتے تھے، چند اور تذکروں میں سید کا ترجمہ دیکھا گیا ہے، تذکرۂ نادر سے مزید چار اشعار دیے جاتے ہیں:

گذار ایں شیوۂ جور و جفا را   بکن یک دم بمن مہر و وفا را

دل عشاق پامال الم شد   کہ کرد آشفتہ گیسوئے دوتا را

گرفتارِ غم ہم بر من نظر کن   خدارا اے جفاگستر خدا را

بقیہ ص ۱۸۰ پر

اور دوسرے شاہ محمد اکبر عرف محمد جان قدسی، جب سید پیدا ہوئے تو ان کے والد شاہ جعفر نے ان کا عرف میرن جان رکھا تھا، اس طرح جب قدسی پیدا ہوئے تو ان کا عرف محمد جان رکھا گیا جب قدسی (محمد اکبر) بڑے ہوئے اور انھیں شاعری کا شوق ہوا تو انھوں نے محمد جان کی مناسبت سے اپنا تخلص قدسی رکھا، سید کا سال ولادت ۱۲۱۲ھ (تذکرہ روز روشن) ہے، اس طرح قدسی کا سال ولادت ۱۲۱۴ھ قیاس کیا جاسکتا ہے، گویا سید، قدسی سے دو ایک برس بڑے ہوں گے۔

(۳)

قدسی کے حالات میں بعض غلطیوں کی تصحیح | ڈاکٹر محمد انصار اللہ کا ایک تحقیقی (مگر حقیقتاً غیر تحقیقی) مضمون "قدسی کی نعت" نیا دور لکھنؤ کے ستمبر ۱۹۸۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے (اس کا تفصیلی جائزہ اس مضمون کے آخری حصہ "نعت قدسی" میں لیا جائے گا) اس میں ڈاکٹر صاحب نے قدسی الٰہ آبادی کے ابتدائی حالات اس طرح لکھے ہیں:

> "اس قدسی کے نہ تو زیادہ حالات کا علم ہے اور نہ اس کے کلام کے بارے میں ہی تفصیلات دستیاب ہیں، اتنی بات البتہ ظاہر ہے کہ اس شاعر کو قدسی مشہدی کی شخصیت اور شاعری سے کسی نہ کسی درجہ میں دلچسپی ضرور تھی، اغلب ہے کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۹):

صنم سرمستِ عشقِ نوجوانی چہ دانم حکمِ پیرِ پارسا را

دو شعر تذکرہ شوکتِ نادری سے ماخوذ ہیں جو معلوم ہوتا ہے نادر (مولف تذکرہ) کی فرمائش پر کہے گئے تھے:

نرگسِ مستش بیک گردش مرا بیمار کرد در شبِ تنہائیم خواب آمدن دشوار کرد
دل اگرچہ مبتلا بود است با تشویشہا سیّد از فرمانِ نادر فکرِ ایں اشعار کرد

اس دلچسپی اور تخلص کی یکسانیت کے سبب اس شاعر کو بھی عام طور سے سید محمد جان کہا جانے لگا تھا" شاعروں کے معاملے بھی بہت دلچسپ ہوتے ہیں، وہ جس نام سے مشہور ہو جاتے ہیں وہی باقی رہ جاتا ہے اور ان کا اصل نام عموماً فراموش ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسی قدسی کا ایک ہم عصر شاعر اپنے تخلص مظلوم کی رعایت سے شاہ مظلوم کر کے مشہور ہو گیا تھا بیشتر تذکروں نے اس کے اصل نام کا خیال بھی نہیں کیا اور لکھا کہ "نامش شاہ مظلوم" یا "مظلوم شاہ"[1] ٹھیک یہی معاملہ اس قدسی کے ساتھ بھی ہوا۔ لکھنے والوں نے عموماً اس کو "سید محمد جان قدسی" لکھا ہے اور نتیجہ کے طور پر ہمارے زمانے میں بعض لوگوں نے اسے "قدسی مشہدی" خیال کر لیا ہے۔

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کے قدسی تذکور کے ساتھ اچھے روابط معلوم ہوتے ہیں۔ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں اس کا بیٹا پیدا ہوا تو نادر نے تاریخ کہی جو ان کے "رسالۂ نو" (قلمی) میں ذیل کے عنوان سے درج ہے:

"قطعۂ تاریخ تہنیت ولادت سید علی اکبر فرزند ارجمند سید محمد جان قدسی"

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ نادر نے اپنے تذکرہ "شوکتِ نادری" میں قدسی کے والد سید شاہ علی جعفر کا ذکر کیا ہے۔ مگر قدسی کا ذکر نہیں کیا۔ تذکرہ ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) میں تالیف ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہ اس لیے ہے کہ اس وقت تک

> "شاعر کی حیثیت سے قدسی متعارف نہیں ہوا تھا۔ اغلب ہے کہ اس وقت تک اس کی عمر پندرہ سولہ برس (یعنی سال ولادت ۳۲-۱۲۳۱ھ) کے قریب رہی ہوگی —"

---

[1] تذکرہ شوکتِ نادری میں مظلوم کا ترجمہ یوں شروع ہوتا ہے "مظلوم۔ انکا نام غلام حسن ہے، لقب دو عرف مظلوم شاہ ....."

آگے چل کر تذکرہ سراپا سخن کے حوالے سے قدسی کا ترجمہ درج کیا ہے (ڈاکٹر صاحب نے ۵ اشعار جو درج تذکرہ ہیں، نہیں دیئے تھے۔ اب میں نے اضافہ کر دیئے ہیں)

"سید محمد اکبر عرف شاہ محمد خاں قدسی ولد شاہ علی جعفر دختر زادۂ حضرت شاہ اجمل علیہ الرحمہ اجمل باشندۂ الٰہ آباد دائرۂ شاہ اجمل، واسطے سیر کے لکھنؤ میں آئے تھے۔ اصلاح شعر کی خواجہ حیدر علی آتش سے لی۔ صاحب دیوان ہے

لگایا میں نے جو شب زلف پر شکن میں ہاتھ — شمیم مشک لگی گلشن ختن میں ہاتھ

یہ شاخ نور ہے یا شمع ہے تہِ فانوس — نہاں ہیں یار مرے دلبر کے پیرہن میں ہاتھ

تمام عمر تو جامہ دری میں گذری ہے — قرار سے رہیں کیونکر مرے کفن میں ہاتھ

تری بلائیں نہ لیں پاؤں بھی نہیں دبے — یہ ہم سمجھتے ہیں بے کار ہیں بدن میں ہاتھ

تسلی دل بلبل ہوئی ہے اے قدسی — ہوئے ہیں قطع جو صیاد کے چمن میں ہاتھ"

مزید معلومات کے لیے اب چند دیگر تذکروں سے قدسی کے حالات درج کیے جاتے ہیں۔

سخن شعرا (سال تالیف تقریباً ۱۸۷۴ء)

"قدسی تخلص سید محمد اکبر عرف محمد جان ولد شاہ علی جعفر، دختر زادہ حضرت شاہ اجمل الٰہ آبادی سیر لکھنؤ میں جا کر آتش کے شاگرد ہوئے تھے۔ صاحب دیوان گذرے ہیں۔ (۲ شعر) ہے

یاد آتی ہیں کافر جو ملاقات کی راتیں — کٹتیں کسی عنوان نہیں برسات کی راتیں

(دوسرا شعر "سراپا سخن" کے تحت درج ہو چکا ہے)"

تذکرۂ نادر (دیوان غریب۔ سال تالیف تقریباً ۱۸۶۶ء)

"قدسی۔ سید محمد جان دختر زادہ شاہ محمد اجمل، باشندۂ دائرۂ الٰہ آباد۔ صاحب دیوان شاگرد حضرت آتش ہے

(۵ شعر۔ معمولی لفظی فرق کے ساتھ وہی ہیں جو سراپا سخن میں درج ہیں)"

شمیم سخن (سال تالیف تقریباً ۱۸۷۲ء)

"قدسی تخلص، سید محمد اکبر عرف سید محمد جان الٰہ آبادی شاگرد خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی صاحب دیوان۔ سید شاہ علی جعفر کے لڑکے اور شاہ محمد اجمل مرحوم کے نواسے تھے۔

(۲ شعر، وہی ہیں جو "سخن شعرا" میں درج ہیں)۔"

روز روشن۔ (سال تالیف تقریباً ۱۸۷۹ء)

"قدسی۔ محمد کبیر (اکبر) الٰہ آبادی معروف بہ سید محمد جان خلف سید علی جعفر محمدی ابن البنت شاہ محمد اجمل الٰہ آبادی ست۔ طبع بلند و فکر ارجمند داشت و قاضی اختر را بادے سلسلۂ دوستی مستحکم بود:

تا کہ با نرگس مست تو مرا کارے نہ بود — دل بیمار من دل شدہ بیمار نہ بود

بغاوت بردہ از من دل پری روئے جفاکارے — ستمگارے دل آزارے طرفہ طرارے

اگر در دل خیال تیر مژگانش نمی باشد — چرا ہر دم درون سینۂ من می خلد خارے

بہجرش روز من تاریک تر شد از شب یلدا — نشد آں ماہ یک شب روشنی بخش شبِ تارے

ڈاکٹر محمد انصار اللہ کے مضمون کے اقتباسات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

(ا) قدسی الٰہ آبادی کو قدسی مشہدی کی شخصیت اور شاعری سے کسی نہ کسی درجے میں دلچسپی ضرور تھی۔"

(ب) "اغلب ہے کہ اس دلچسپی اور تخلص کی نسبت کے سبب اس شاعر (قدسی الٰہ آبادی) کو بھی عام طور سے سید محمد جان کہا جانے لگا تھا۔"

(ج) تذکرۂ شوکت نادری میں قدسی کے والد شاہ علی جعفر کا ذکر تو ہے مگر قدسی کا

نہیں کیونکہ اس کی تالیف ۱۲۴۷ھ کے وقت قدسی پندرہ سولہ سال کے ہوں گے اور وہ شاعر کی حیثیت سے ابھی متعارف نہ ہونگے (گویا قدسی کا سال ولادت ۱۲۳۱-۳۲ھ قرار دیا جاسکتا ہے) میں عرض کرتا ہوں کہ (۲) (ب) اور (ج) تینوں قطعی غلط ہیں کیونکہ قدسی کی ولادت سے پہلے انکے والدین نے ان کے بڑے بھائی سید کی عرفیت میرن جان قرار دی تھی اسی طرح صاف ظاہر ہے کہ دوسرے بیٹے کی ولادت پر عرفیت محمد جان قرار دے دی گئی۔ جب طبیعت شعر کہنے کی طرف مائل ہوئی تو "محمد جان" کی عرفیت اور مشہور شاعر حاجی محمد جان قدسی مشہدی کے نام اور تخلص کے سبب اس کا تخلص بھی قدسی ٹھہر گیا۔ اس لیے یہ کہیں سے ثابت نہیں ہوتا کہ قدسی الٰہ آبادی کو قدسی مشہدی کی شخصیت اور شاعری سے کسی درجے میں کوئی دلچسپی بھی رہی تھی یا لوگوں نے قدسی تخلص کی بنا پر اسے محمد جان کا نام دے دیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی غلط لکھا ہے کہ تذکرۂ شوکت نادری میں قدسی کا ترجمہ نہیں ہے، میرے پیش نظر تذکرۂ شوکت نادری از مرزا کلب حسین خاں بہادر نادر مرتبہ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ (ستمبر ۱۹۸۴ء) اصل فارسی متن سے اردو میں ترجمہ بھی ڈاکٹر شاہ عبدالسلام ہی نے کیا ہے۔ اس تذکرے کے صفحہ ۳۸ پر قدسی کا ترجمہ موجود ہے ملاحظہ کیجئے:

"قدسی"

آپ کا نام نامی سید محمد جان ہے اور حضرت شاہ محمد اجمل مرحوم کے پوتے [نواسے] ہیں۔ جناب خواجہ حیدر علی آتش سے شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ آپکی طبع رسا اس فن کے نہایت مناسب واقع ہوئی ہے اور آج کل اپنی فکر بلند کے ذریعے داد سخن

دے رہے ہیں اور جواہر معانی کے عمدہ پرونے والوں میں آپ کا شمار ہے۔

اس شہر (الٰہ آباد) میں نظم اردو کے اندر بہت کم اپنی نظیر رکھتے ہیں اور ہمیشہ مضامین کی پری کو اپنے سینۂ خیال میں مسخر رکھتے ہیں۔ آپ کی بلند طبیعت کے کچھ نتائج یہ ہیں ؎

[مطلع سخن شعرا کے تحت درج ہو چکا ہے]

تم چاندنی راتوں کے مزے لو ٹو جو پیو   آجائیں گی اپنی بھی کبھی گھات کی راتیں
گہ برق کا صدمہ ہے کہیں رعد فلک کا   برسات کی راتیں ہیں کہ آفات کی راتیں

اس ترجمے میں نادر نے جس احترام سے قدسی کا ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قدسی نادر سے عمر میں (اور مرتبے میں بھی) بڑے تھے۔ نادر کا سال ولادت ۱۲۲۰ھ ہے۔ اس طرح قدسی کا ۱۲۱۴ھ کا قیاسی سال ولادت حقیقت سے کچھ زیادہ دور نہ ہوگا۔ اس روشنی میں تذکرہ شوکت نادری کی تالیف کے وقت قدسی، ڈاکٹر صاحب کے مقرر کیے ہوئے پندرہ سولہ سال کی عمر کے نہیں بلکہ تینتیس ۳۳ سال کی پختہ عمر کے تھے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس وقت قدسی، "اس شہر [الٰہ آباد] میں نظم اردو کے اندر [نظم فارسی کے اندر نہیں] بہت کم اپنی نظیر رکھتے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے قیاس کیا ہے۔ قدسی الٰہ آبادی کی ولادت ۱۲۳۱-۳۲ھ تو قرار دی ہی نہیں جاسکتی۔ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ ۱۲۱۴-۱۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہونگے۔ قدسی کے والد شاہ علی جعفر کا انتقال (ولادت کم از کم ۱۱۹۲ھ) ۱۲۴۹ھ میں ہوا تھا: اسطرح باپ کی وفات کے وقت قدسی ۳۵ سال کے ہوئے اور ماموں شاہ ابو المعالی عالی کے انتقال (۱۲۵۲ھ) کے وقت ۳۸ سال کے۔ نانا شاہ اجمل (کہ اپنے عہد کی ایک برگزیدہ ہستی تھے) کا انتقال ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں ہوا تھا اسوقت قدسی کی عمر ۲۲ سال کی ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ سید اور قدسی کی عرفیت میرن جان اور محمد جان انکے نانا ہی کی عطا ہو۔ (باقی)

سلسلۂ چشتیہ کے امتیازات

از

جناب مولانا غلام محمد صاحب، کراچی

ہر سلسلۂ طریقت کے کچھ امتیازات ہیں جن کا بیشتر تعلق تدبیر اور حکمتِ معالجۂ نفس سے ہے یا پھر نسبت کے لون سے ہے۔ انہی امتیازات کی وجہ سے سلاسلِ طریقت کا الگ الگ تشخص ہے ورنہ منزل سب کی ایک اور مقصد ہر ایک کا حصولِ رضائے حق کے سوا کچھ نہیں اسی لیے اہل سلاسل مختلف ہو کر بھی ایک جان ہیں ع متحد جانند مردانِ خدا است
اس حقیقت کو ذہن میں محفوظ رکھتے ہوئے یہاں سلسلہ عالیہ چشتیہ کے امتیازات کا جائزہ لینا ہے۔

تاریخیت — تاریخی اعتبار سے سلسلہ چشتیہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ زماناً قدیم ترین سلسلۂ تصوف ہے۔ اس کے بانی حضرت اقدس ابو اسحاق شامی ثم چشتی (قدس سرہٗ) ہیں، جن کی نہ صرف پیدائش چشتِ سافلان (خراسان) میں ہوئی بلکہ ان کے شیخ حضرت اقدس ممشاد دینوری قدس سرہٗ نے ان کو ابو اسحاق "چشتی" کا نام دیا اور چشت کو فیضان باطنی کا مرکز بنانے کی تاکید فرما کر قیامت تک سلسلۂ چشتیہ کے جاری رہنے کی بشارت دی[1]۔ حضرت ابو اسحاقؒ کی تاریخ رحلت ۳۲۹ھ ہے[2]۔ اس طرح ان کا عرصۂ حیات

[1] تاریخ مشائخ چشت مولفہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہٗ [2] حضرت ممدوح کا مزار مقام عکہ (شام) میں ہے۔

تیسری صدی میں زیادہ اور چوتھی صدی کے ۲۹ سال پر پھیلا ہوا ہے۔ چونکہ نوعمری ہی میں انھوں نے اپنے شیخ عالی مقام سے بیعت کا شرف پا لیا تھا اور ۷ سال کے تعلق میں خلافت پا کر چشت میں مشغول ارشاد ہو چکے تھے اس لیے یہ بات بدیہی ہے کہ تیسری صدی ہجری ہی میں ان کی ذات بابرکات سے سلسلہ چشتیہ کی بنا پڑ گئی تھی جبکہ سلاسل قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، شاذلیہ اور رفاعیہ وغیرہ کا آغاز پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ہوا ہے حضرت اقدس معین الدین سجزی ثم اجمیری (ف ۶۲۷ھ) قدس سرہٗ تو سلسلہ چشتیہ کی آٹھویں جلیل القدر ہستی ہیں جو سلطان الہند اور غریب نواز کے القاب سے ملقب اور مجدد طریق چشتیہ ہیں جیسا کہ شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے بھی ہمعات میں تحریر فرمایا ہے (ہمعہ ۱)

نصاب سلوک سے بے نیازی — حضرات چشتیہ کا ایک امتیاز یہ ہے کہ ان کے ہاں سلوک کا بندھا ٹکا کوئی نصاب مدون نہیں بلکہ ہر طالب طریق کی انفرادیت پر نظر کر کے تجویز علاج کا دستور ہے، مشہور فلسفی و صوفی حضرت ڈاکٹر میر ولی الدین حیدر آبادیؒ نے ایک مرتبہ اس عاجز سے سوال کیا[1] کہ یہ کیا بات کہ سلاسل نقشبندیہ و قادریہ وغیرہ میں سلوک کا نصاب متعین ہے مگر چشتیہ میں نہیں ملتا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ احقر نے عرض کیا ہمارے ہاں ہر طالب طریق کی انفرادیت کو پیش نظر رکھ کر ہدایت کا تعین

[1] ۱۹۵۶ء میں میں حیدر آباد دکن پہنچا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح نے اپنی شفقت خاص سے چائے پر مدعو فرمایا اور اپنے دو ایک ہم مذاق احباب کو بھی بلا لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سوال کے ذریعہ گفتگو چھیڑا کرتے تھے، چنانچہ اس پاکیزہ صحبت میں یہ سوال فرمایا تھا تاکہ مسئول کے جواب کی توثیق یا تصحیح ہو جائے۔

ہوتا ہے اور جس میں جو مرض یا کوتاہی بنیادی نوعیت کی نظر آتی ہے اس کی شفا کی تدبیر کی جاتی ہے اور یہ مذاق عین سنت نبوی کے مطابق ہے، چنانچہ احادیث مبارکہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی سوال کہ ایمان کیا ہے یا اسلام کیا ہے؟ مختلف صحابۂ کرام پیش فرماتے ہیں اور ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہر ایک کو جواب الگ الگ عطا ہوتا ہے کسی سے آپ یہ فرماتے ہیں کہ ایمان نام ہے اللہ کی خاطر محبت اور اللہ کی خاطر بغض رکھنے کا، کسی سے ارشاد ہوتا ہے صبر و سماحت ایمان ہے کسی کو جواباً کثرت ذکر اللہ کی تلقین فرمائی جاتی ہے وغیرہا[1]۔ اس سے اس عاجز نے تو یہی سمجھا کہ تربیتی و اصلاحی حکمت نبوی یہی تھی کہ جس سائل کے اجزائے ایمانی یا فرائض اسلامی میں جس جزو کی کمی آپ نے محسوس فرمائی اسی کی تکمیل کا اشارہ فرمایا تاکہ وہ مومن کامل بن جائے۔

معالجۂ باطنی کی یہی حکمت مشائخ چشت نے اختیار فرمائی ہے اسی لیے ان کے ہاں تدوین نصاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ احقر کے اس جواب پر حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے اظہار سرور فرما کر گویا مہر تصدیق ثبت فرما دی، وہ خود چشتی تھے۔

مذکورہ نظریہ کی اصل تصدیق حضرت سلطان اولیا، محبوب الٰہی دہلوی قدس سرہ کے اس ارشاد سے حاصل کیجئے فرماتے ہیں :۔

"مختلف افراد مختلف کاموں کے لیے موزوں ہوتے ہیں، اس لیے میں کسی سے تو یہ کہتا ہوں کہ اپنے لب کو بھی بند رکھے اور اپنے دروازے کو بھی، کسی کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ مریدوں کی تعداد بڑھائے اور کسی کو یہ حکم دیتا ہوں کہ خلق اللہ کے درمیان ہی میں رہے اور ان کی جفاؤں کو برداشت کرتے ہوئے ان سے

---

[1] اجمالی اطلاع کے لیے ملاحظہ ہو مشکوٰۃ شریف، کتاب الایمان فصل ثالث

حسن سلوک سے پیش آئے یہی مقام انبیاء اور اولیاء کا ہے"[1]

محرک طریق | تمام اہم سلاسل کی امتیازیت کو قائم کرنے والی ایک چیز "محرک طریق" کا تعین ہے یعنی گو تمام سلاسل میں تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، تزئین اخلاق، اتباع سنت اور استحکام نسبت مع اللہ کا اہتمام ہے، مگر سالکین طریق کو آمادہ و مستعد راہ رکھنے کے لیے ہر سلسلہ کے مشائخ نے الگ الگ "محرک" اختیار کیا ہے کہیں فی نفسہٖ "اتباع سنت" ہی کے "شعور" کو محرک طریق بتایا گیا، کسی سلسلہ میں "خوف و خشیت الٰہی" کو محرک سلوک قرار دیا گیا، کہیں "صبر" کی تلقین کو محرک راہ ٹھہرایا گیا۔ مگر مشائخ چشت نے "عشق الٰہی" کو بطور "محرک" استعمال فرمایا، وہ سالک کے دل میں عشق الٰہی کی آگ بھڑکا دیتے ہیں جس سے رذائل نفس کا خارزار جل کر بھسم ہو جاتا ہے، غیرت حب الٰہی سے کل غیر اللہ سے انقطاع کلی حاصل ہو جاتا ہے، اپنے ننگ و ناموس کا واہمہ تک باقی نہیں رہتا ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما ۔۔۔ اے طبیب جملہ علتہائے ما

قرب خاص کی منزل تک عشق کا رفرف آناً فاناً پہنچا دیتا ہے،

اس طریق کا امتیاز ہی یہ ہے کہ اس میں کوئی داخل ہوا نہیں کہ اس کو دولت عشق مل جاتی ہے ؎

ہر کو مرید سید گیسو دراز شد ۔۔۔ واللہ خلاف نیست او کہ عشقباز شد

شاہ وارث حسن لکھنوی نور اللہ مرقدہٗ خلیفۂ حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ فرماتے ہیں :۔

---

[1] سیر العارفین ص ۲۳۸۔

"ان لوگوں کو بشارت ہو جو اس سلسلہ (چشتیہ) میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ جب مطلوب سے رابطہ عشق پیدا ہو جاتا ہے تو جملہ منازل خود بخود طے ہو جاتے ہیں.... علاوہ ازیں ذوق و شوق کے گھوڑے پر سوار ہو کر راستہ بھی جلد طے ہو جاتا ہے ... حضرات چشتیہ کی نسبت عشقیہ چونکہ قوی ہوتی ہے انکی طاعت بھی حق تعالیٰ کی نگاہ میں زیادہ مقبول ہوتی ہے"[1]

اس قول پر بے ساختہ اپنے شیخ حضرت سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کا وجد آفریں شعر یاد آیا، فرماتے ہیں ؎

فرہاد کی جو بات ہے، مزدورکی نہیں
ہر ضرب تیشہ، ساغر کیف وصال دوست

سب سے بڑھ کر خود حضرت خواجۂ اجمیری قدس سرہٗ کا یہ ارشاد کہ :-

"عارف عشق الٰہی میں ایسا کھو جاتا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اس کی قدرت کاملہ میں محو اور متحیر رہتا ہے اور وہ ایک قدم بڑھا کر عرش سے حجاب عظمت اور حجاب عظمت سے حجاب اکبر تک پہنچ جاتا ہے اور دوسرے قدم میں واپس آجاتا ہے یہ تو عارف کا کمترین درجہ ہے۔ ایک عارف کامل (زور عشق سے) کہاں تک پہنچ جاتا ہے، وہ تو خدا ہی جانتا ہے"۔ (دلیل العارفین ص ۶)

چشتیہ کے "عشقی امتیاز" کا ذکر آیا تو بطور جملہ معترضہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی چشتی کا یہ ارشاد سنا دینا بھی مفید مطلب معلوم ہوتا ہے کہ :-

"اپنے دردمند مزاج اور نسبت عشقیہ کی بنا پر بھی جو سلسلہ چشتیہ کا سرمایہ ہے، اس سلسلہ کو ہندوستان کا دل جیت لینا اور اس کو اپنی محبت کا اسیر اور عشق الٰہی کا نخچیر بنا لینا آسان تھا کہ زمانہ قدیم سے محبت و درد اس سرزمین کے خمیر میں ہے"[2]

---

[1] شمامۃ العنبریہ مصنفہ حضرت ذوقی شاہ رحمۃ اللہ علیہ صفحات ۱۳۶ تا ۱۳۸ [2] تاریخ دعوت و عزیمت جلد سوم ۔ صفحہ ۳۰۳ (پاکستانی ایڈیشن)

شان فنائیت | ایک اور وصف امتیازی یہ ہے کہ جہاں مثلاً قادریہ میں شان جلال اور نقشبندیہ میں تمکنت و وقار کا اثر نمایاں ہے وہاں چشتیہ میں نیستی اور التزام ہستی سے برأت گویا ان کا شعار ہے ؎

یہاں مستوں کے سر التزام ہستی ہی نہیں اصغر
پھر اسکے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

حضرت نظام الدین محبوب الٰہی قدس سرہٗ کس زور اور تاکید سے فرماتے ہیں :-

"بسوز اول شیخ الاسلامی را و پس خانقاہ را و بعد ازاں خود را"[1]

اس سلسلے کے تو بڑے سے بڑے شیوخ بھی خود کو ہیچ در ہیچ ہی سمجھتے رہے ہیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ اپنے پیر و مرشد شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ :

"وہاں تو مٹ جانے اور فنا ہو جانے ہی کا سبق ملتا تھا۔ یہ حالت تھی کہ اپنے ہر ہر خادم کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے (فرماتے تھے) کہ آنے والوں کے قدموں کی زیارت کو اپنے لیے ذریعہ نجات سمجھتا ہوں"[2]

اور دیکھئے بانیان سلسلہ چشتیہ صابریہ و سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے شیخ گرامی حضرت اقدس مسعود فریدالدین گنج شکر (معروف بہ بابا گنج شکر) قدس سرہٗ (ف ۶۶۴ھ) کے مقام عظمت کا کہنا ہی کیا ہے مگر خود کو مٹائے رکھنے کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ خانقاہ میں کچھ درویش آئے، حضرت کے گھر میں جوار کے سوا کچھ نہ تھا، حضرت نے فوراً خود ہی جوار پیسی، روٹیاں پکائیں اور درویشوں کو کھلایا، یہ خیر المجالس کی روایت ہے اور فوائد الفواد میں ہے کہ حضرت کے پاؤں میں تکلیف ہو گئی تھی جس کی وجہ سے آپ کو

---

[1] فوائد الفواد - جلد اول - ملفوظ - ۳۰ [2] الافاضات الیومیہ ص ۲۱۲ (ملفوظات حضرت حکیم الامت)

مریدوں کی مجلس میں چارپائی پر بیٹھنا پڑا، ظاہر ہے کہ بلا عذر کے بھی اس طرح بیٹھنا شیخ کے لیے عین مناسب تھا مگر فنائیت کا یہ عالم تھا کہ اس نشست پر اپنے مریدوں سے معذرت فرمائی اور جو عذر لاحق تھا اس کی صفائی پیش فرمادی۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ اس مجلس میں حاضر و موجود تھے حضرت شیخ کے اس اظہار پر والہانہ انداز میں یہ بیت پڑھ دی

جان جہانیاں توئی دشمن جاں بود کسے — اے ہمہ دشمنان تو دشمن جان خویشتن

یہ ایک جھلک ہے حضرات چشت کی شان فنائیت کی جو ان کا امتیاز ہے،

اصطلاحات سے گریز

اکابر چشتیہ کا ایک شرف و امتیاز یہ بھی ہے کہ فن تصوف و احسان کو قرون خیر کے تکلف سے بری "حسن ذاتی" پر رہنے دیا اور اس کی "قبا" کو فلسفیانہ اور متکلمانہ "گلکاری"[۱] سے بچائے رکھا۔ نہ مروجہ اصطلاحات کو تصوف میں داخل کیا نہ خود وضعی اصطلاحات فلسفہ و کلام سے اس کو بوجھل کیا، بانی سلسلہ حضرت ابو اسحاق شامی ثم چشتی قدس سرہٗ کے دور سے لے کر آج تک اکابر شیوخ چشتیہ کے ملفوظات میں تلقین کی بڑی سادگی اور سلف صالحین کے اقوال کی پر تاثیری ملتی ہے گو غلبۂ عشق الٰہی اور فنائیت تامہ کی وجہ سے چشتیہ حضرات کا مذاق وجودی رہا ہے مگر یہ مذاق اتنا قدیم ہے کہ بعد کو چھٹی ساتویں ہجری میں حضرت اقدس شیخ اکبر محی الدین عربی قدس سرہٗ کے ذریعہ اس مسئلہ کی فلسفیانہ و متکلمانہ انداز میں جو تدوین ہوئی اس کو اب تک سلسلہ چشتیہ میں سالکین طریق کی تربیت میں نہ برتا جاتا ہے نہ شرط طریق کی اس کو حیثیت حاصل ہے، حالانکہ یہی حضرات اس کی حقیقت کے سمجھنے والے ہیں[۲]، دراصل

[۱] تکلف سے بری ہے حسن ذاتی — قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے (اکبر)

[۲] سلسلۂ اکبریہ جو شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ سے چلا اور سادات جیلانیہ سے پھیلا (بقیہ حاشیہ ص ۱۹۳)

انھوں نے اس کی افہام و تفہیم اگر ضروری بھی سمجھی تو اس کے لیے حضرت شیخ اکبر کے ہم مذاق معاصر شہیر حضرت اقدس جلال الدین رومی قدس سرہٗ کے طرز کو قبول کیا کہ حقیقت وحدۃ الوجود کو بغیر اصطلاحاتی دشواری اور پیچیدگی کے تمثیلات اور حکایات کے ذریعہ سمجھا دیا جائے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پچھلی صدیوں میں حضرات چشتیہ میں مثنوی معنوی سے خاص شغف نظر آتا ہے اور ہمارے قریبی دور میں تو حضرت اقدس حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کا درس مثنوی ہندوستان اور ان کے بیالیس سالہ قیام مکہ مکرمہ کے دوران عالم اسلام میں مشہور رہا ہے، اور حضرت ممدوح اور ان کے خلفا خصوصاً حضرت مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ، حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ اور حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانویؒ کے ذریعہ اس کو بہت فروغ ملا ہے،

کوئی ایسی شرط طریق نہیں جو سنت سے ثابت نہ ہو

حضرت مولانا عبد الباری ندوی نور اللہ مرقدہٗ نے اس بارے میں اپنے شیخ عالی مقام حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا ارشاد نقل کرنے سے پہلے یہ تحریر فرمایا ہے کہ "انصاف تو یہ ہے کہ حضرات چشتیہ کو اتباع سنت میں خاص امتیاز

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۲) جیسا کہ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے رسالہ انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں طریقۂ قادریہؒ کے زیر عنوان تحریر فرمایا ہے)، اس سلسلہ میں شیخ اکبر قدس سرہٗ کی فصوص اور فتوحات مکیہ کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے[۱] چنانچہ حضرت شیخ اکبرؒ کے تذکرہ میں ملتا ہے کہ جب شیخ کا وصال ہوا تو ان کے حلقہ نشین میں سے اکثر حضرات نے اپنی ذوق خاص کی تسکین مولانا رومی قدس سرہٗ کی صحبت میں پائی دوسرا مستحکم ثبوت ہم مذاقی کا یہ ہے کہ بحر العلوم مولانا عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی معنوی کی جو شرح تحریر فرمائی ہے، اس میں بہت زیادہ توضیحات شیخ اکبرؒ کے ارشادات ہی سے لکھی ہیں جو بغیر اتحاد مذاق کے ممکن نہ تھا۔

حاصل ہے، حتیٰ کہ ان کی تعلیمات میں حصول مقصود کے لیے کوئی ایسی شرط نہیں جو سنت سے صراحتہً ثابت نہ ہو جس کا ایک نمونہ یہ ہے، حضرت تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں۔

"حضرات نقشبندیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے متبع سنت ہونے پر قریب قریب سب کو اتفاق ہے اور صحیح اتفاق ہے، مگر خود ان کے طریق میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو نصوص میں وارد نہیں، شرط طریق ہیں اور شرط بھی اعظم دائم۔ چنانچہ تصور شیخ باوجودیکہ صریحاً کسی نص میں وارد نہیں اور پھر خطرناک بھی ہے اور بعض کو اس میں غلو بھی ہو گیا ہے اور اس خطرہ و غلو کے سبب مولانا شہیدؒ اس کو منع فرماتے ہیں مگر باوجود اسکے اکابر نقشبندیہ اس کو شرط مقصود فرماتے ہیں، چنانچہ انوار العارفین ذکر تصور شیخ میں کنز الہدایہ بحوالہ مکتوبات حضرت مجدد صاحبؒ کا ارشاد نقل ہے کہ

"ذکر تنہا بے رابطہ و بے فنائی الشیخ موصل نیست ذکر ہرچند از اسباب وصول است لیکن غالباً مشروط بہ رابطہ محبت و فنا در شیخ است اما ایں رابطہ تنہا یا رعایت آداب صحبت و توجہ والتفات شیخ بے التزام ذکر موصل است۔"

اور گو چشتیہ میں بھی مثل دیگر طرق کے ایسے اشغال ہیں جو صریح سنت میں وارد نہیں مگر کوئی شغل شرط طریق نہیں بلکہ مطلق شغل بھی شرط طریق نہیں، بعض کے لیے صرف ذکر ہی کافی ہو جاتا ہے۔ پس چشتیہ کی شان بالکل حنفیہ کے مشابہ ہے کہ باوجود تمام مذاہب سے زیادہ سنت میں شدید الاتباع ہونے کے، جیسا کہ انکے اصول سے ظاہر ہے، اپنے دقیق مآخذ کے سبب مخالف حدیث میں بدنام ہیں، اسی طرح چشتیہ کے اصول سے ان کا سنت میں شدید الاتباع ہونا ظاہر ہے، جیسے کہ اوپر ایک

اصل دلیل گزری کہ ان کے طریق میں کوئی امر ایسا شرط مقصود نہیں جو سنت میں وارد نہ ہو اور اصول ہی اصل معیار ہیں۔"[1]

اس اجمالی شرح کی تفصیل کے لیے حضرت تھانویؒ کی اصل تصنیف "السنۃ الجلیہ فی چشتیۃ العلیۃ" کا مطالعہ ضروری ہے،

ملت محمدیہ کی صلاح و فلاح پر پوری توجہ مگر سلاطین سے گریز

اپنی ساری شان فقر و مسکنت اور استغنا عن الخلق کے باوجود حضرات چشتیہ کی مکمل توجہ ملت اسلامیہ کی صلاح و فلاح اور مسلم اقتدار کے قیام و بقا اور ملت کفریہ میں دین کی تبلیغ پر ہمیشہ مرکوز رہی ہے حالانکہ دربار اور سلاطین سے یہ حضرات ہمیشہ اپنا پہلو بچائے ہوئے رہے۔ حضرت خواجہ ابو محمد چشتی (ف ۴۱۱ھ) سلطان محمود غزنویؒ کی فتوحات میں اس کے پشت پناہ بنے رہے یہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری (ف ۶۲۷ھ) کی روحانی توجہ و تائید کا نتیجہ تھا کہ پرتھوی راج کا اقتدار سلطان شہاب الدین غوری کے ہاتھ میں آگیا۔ یہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (ف ۶۳۳ھ) کا فیضان تھا کہ ہندوستان کو سلطان شمس الدین التتمش جیسا زاہد و عابد بادشاہ میسر آیا۔ یہ حضرت فرید الدین گنج شکر (ف ۶۶۴ھ) کی توجہ کا اثر تھا کہ ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن جیسے دیندار سلاطین مسلمانان ہند کو ملے اور اس کے بعد سلطان الاولیاء نظام الدین محبوب الٰہیؒ (ف ۷۲۵ھ) کے ہاتھ میں تو قسام ازل نے پورے برصغیر ہند کی معنوی باگ ڈور دے دی تھی، حضرت محبوب الٰہی نے پانچ سلاطین کا دور پایا، جس بادشاہ نے ان کی دعا لی اس کو فتوحات حاصل ہوئیں۔

---

[1] تجدید تصوف و سلوک از مولانا عبد الباری ندویؒ بحوالہ "السنۃ الجلیہ فی چشتیۃ العلیۃ" تالیف حضرت اقدس مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔

اور جس نے خود سری دکھائی، قہر الٰہی کی گرفت میں آگیا۔ ان کے عہد میں فتوحات اسلامی اور تبلیغ دین کا کام جس نظم اور شکوہ سے ہوا، ہندوستان کے طول و عرض میں قرآن پاک سے شغف اور پیروئی سنت کا ذوق جس قدر عام ہوگیا وہ اپنی نظیر آپ تھا، پھر ان کے بعد ان کے مرکزی خلیفہ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ (ف ۷۵۷ھ) نے اسی نہج پر کام جاری رکھا، ان کی نظر توجہ سلطان محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق پر اور ان کے اہل دربار کی اصلاح پر برابر مرکوز رہی۔ اسی طرح دکن میں ان کے خلیفۂ اجل حضرت سید محمد گیسو درازؒ (ف ۸۲۵ھ) سے نہ صرف دکن کے عام مسلمان فیضیاب رہے بلکہ بہمنی اقتدار پہ حضرت کا اتنا گہرا اثر رہا کہ احمد شاہ بہمنی ان کا مرید ہی ہوگیا تھا، پھر کیا تھا ۔

ہر کو مرید سید گیسو درازؒ شد   واللہ خلاف نیست کہ او عشقباز شد

جہاں تک دعوت دین اور امت دعوت میں تبلیغی مساعی کا تعلق ہے، حضرات چشتیہ کی ادا اظہر من الشمس ہے، خراسان سے لے کر ہندوستان اور ہندوستان سے گذر کر جین میں اسلام کی تنویر انہی کے قدم سے پھیلی ہے، یہ جامعیت "خلوت گزینی" اور "کارجہانبانی" آج تک سلسلۂ چشتیہ کے غیر رسمی حقیقی شیوخ کا امتیاز ہے۔ شیخ العرب والعجم شاہ امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے خلفاء بلکہ خلفاء کے خلفاء[1] کی مثالیں آنکھوں کے سامنے ہیں کہ یہ تمام فقر و استغنا، ذہنی اصلاح اور غلبۂ دین میں ان کی مساعی ناقابل انکار ہیں۔ اس کی تفصیل ہمارے موضوع پر بوجھ ہوگی، جن حضرات کو اس پہلو سے دلچسپی ہو وہ کم از کم مولانا محمد نور الحق علوی دہلوی کا پُر مغز مقالہ زیر عنوان

---

[1] مثلاً شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ وغیرہ۔

"تصوف و صوفیہ اور ہندوستان میں ان کی برکات"[1] اور حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تصنیف "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" (جلد دوم) اور حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی کی تصنیف "مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی تحریک" کا مطالعہ ہی فرمالیں۔

نسبت چشتیہ آخر میں ایک اہم امتیاز کا ذکر ضروری ہے جس کا تعلق نسبت چشتیہ کے لون سے ہے، دراصل نسبتوں کے الوان ہی مختلف سلاسل تصوف کو ایک دوسرے سے ممیز رکھتے ہیں۔ یہ نسبتیں ریڈیائی موجوں کی طرح فضائے عالم میں سرایت کی ہوئی ہیں۔ ان نسبتوں کا رنگ اور ان کی اصل الگ الگ ہے چنانچہ نسبت چشتیہ "فیض عینیت" کا امتیازی و اختصاصی وصف رکھتی ہے حضرت نور الحسن خاں عرف نور میاں[2] رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چھوٹا سا رسالہ شہرۂ آفاق کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے، اس میں سلاسل اربع کی نسبتوں اور ان کے الوان کی تشریح بڑے ایجاز سے فرمائی ہے، وہ نسبت چشتیہ کی حقیقت اس طرح بیان فرماتے ہیں

"بزرگان چشتیہ میں خاص نسبت علوی کا ظہور ہے اور وہ فیض عینیت کا ہے
کہ علی منی و انا منہ سے عبارت ہے اور آپ کی نسبت عیسوی تھی تو نہ
نفخت فیہ من روحی کی مناسبت ہے کہ چشتیہ کا ورد بے سماع[3] کے آرام نہیں"

---

[1] شایع کردہ کتب خانہ الفرقان۔ لکھنؤ [2] حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہٗ کے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں [3] حضرات چشتیہ کا سماع جو اہل ہوس کے ہاتھوں کچھ سے کچھ ہوگیا، چنگ و رباب کی حرمت خود اکابر چشتیہ کے ملفوظات میں موجود ہے۔ تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب "جواہر الفوائد"۔

نہیں ہوتا اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ لم اعبد ربا لم ارہ[1]

اور فرمایا کہ لو کشف غطاء ما ازددت یقینا۔[2]

حضرت سلطان جی (نظام الدین محبوب الٰہیؒ) سے کسی نے پوچھا کہ آپ میں اور حضرت محبوب سبحانی (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ) میں کیا فرق ہے؟ تو فرمایا وہ بیاہی تھے میں آنکھ لگی ہوں۔

حضرت شاہ آفاقؒ نے اس میں نکتہ بیان فرمایا "آنکھ لگی میں ایک چوٹ ہوتی ہے کہ بیاہی میں نہیں ہوتی"۔

غرض "فیض عنیت" اور محبت الٰہی کا سوز و درد، اسکی کسک اور تڑپ چشتیہ لون کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

حضرت عارف تھانویؒ نے ایک وعظ میں سورہ دہر کی ان دو آیتوں

(۱) اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝ (۵)	جو نیک ہیں وہ ایسے جام شراب سے پینگے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔
(۲) وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۝ (۱۷)	اور وہاں ان کو ایسا جام شراب پلایا جائیگا جسمیں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔

کے ضمن میں بہ طور لطیفہ یہ ارشاد فرمایا کہ مذکورہ شراب کی دو قسموں سے پتہ چلا کہ بس اصل لون تو دو ہی ہیں، ایک بردخمود (کَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا) کا جو حضرات نقشبندیہ کا ہے۔ اور دوسرا فرو فتن و سوختن (کَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا) کا جو حضرات چشتیہ کا ہے[3]

علامہ علی بن احمد بن ابراہیم المہائمیؒ نے بھی اپنی تفسیر "تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان" میں زنجبیلی جام شراب کی تاثیر یہ لکھی ہے کہ اس کے پینے والوں میں شوق کا اس قدر غلبہ ہوگا کہ کسی حال و مقام پر ان کو قرار حاصل نہ رہے گا بلکہ قوت شوق سے وہ بڑھتے ہی رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ یہ نعمت سب کو عطا فرمائے ؎

آں روز بر دلم در معنی کشودہ شد　کز ساکنان درگہ پیر مغاں شدم

والحمد فی الاولیٰ والآخرہ۔

---

[1] یعنی جب تک رب کا مشاہدہ حاصل نہ کیا اسکی عبادت نہیں کی (تلخیص فوائد الفواد) باب سوم [2] یعنی اگر حجاب ہٹ جائے (اور ذات الٰہیہ سامنے آجائے) تو میرے یقین میں کوئی زیادتی نہیں ہوگی [3] حضرت کا وعظ اسوقت میرے سامنے نہیں ہے اس لیے یہ روایت بالمعنی سمجھی جائے، باقی یہ نکتہ چونکہ بارہا لطف لے کر پڑھا اور نقل کیا ہے، اس لیے نکتہ میں ذرہ برابر شبہہ نہیں ہے۔

مولوی فیض الحسن سہارن پوری

عربی زبان کے ادیب و شاعر

از

جناب شیخ نذیر حسین، مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

یو۔پی (اترپردیش، بھارت) کے مغربی اضلاع، سہارن پور، مظفر نگر اور میرٹھ دہلی کے قرب کی وجہ سے علوم اسلامیہ کے مخزن رہے ہیں۔ گذشتہ دو صدیوں میں ان اضلاع کی خاک پاک سے سینکڑوں علماء اور صلحاء اٹھے ہیں جنھوں نے علوم اسلامیہ کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں سے ایک مولوی فیض الحسن سہارن پوری تھے، جو انیسویں صدی عیسوی میں عربی زبان و ادب کے مسلّم الثبوت استاد، شاعر اور ادیب تھے۔

مولوی فیض الحسن ۱۸۱۶ء میں سہارن پور کے ایک زمیندار مگر علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خلیفہ علی بخش تھا جو قرآن مجید کے حافظ اور عربی و فارسی ادبیات کے عالم تھے۔ مولوی فیض الحسن نے ابتدائی درسی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے مشہور معقولی عالم مولوی فضل حق خیر آبادی کی خدمت میں رام پور حاضر ہوئے مولانا خیر آبادی کے تبحر علمی اور تدریسی مہارت کی وجہ سے رام پور علوم اسلامیہ کی تدریس کا بڑا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولوی فیض الحسن مولانا خیر آبادی کے علم و فضل اور طلبہ سے

ان کی محبت و شفقت کے عمر بھر مداح رہے۔

رام پور سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولوی فیض الحسن دہلی چلے آئے (۱۸۴۳ء) حکیم امام الدین سے طب کی کتابیں پڑھیں اور حدیث کی تحصیل شاہ احمد سعید مجددی سے کی۔

اس وقت دہلی مجمع الکمال بنا ہوا تھا جتنے علماء، ادباء، صلحا اور اطبا دہلی میں تھے اتنے اور کسی شہر میں نہ ہوں گے۔ ان علماء و ادباء میں سرفہرست مفتی صدر الدین آزردہ تھے جو عربی زبان کے صاحب ذوق اور صاحب بصیرت عالم تھے۔ تذکرہ نگار مفتی صاحب کے فضل و کمال اور ان کی ذاتی صفات کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا بیان ہے کہ درسیات میں دیوان متنبی سب سے پہلے مفتی صاحب کے حسن ذوق سے شامل ہوا ورنہ اس سے پہلے عربی ادب کی تدریس صرف مقامات حریری اور سبعہ معلقہ تک محدود تھی۔ مفتی صاحب صدالصدور کے سرکاری فرائض کی ادائیگی کے علاوہ طلبہ کو گھر پر بھی پڑھاتے تھے۔ ان کا دیوان خانہ اہل علم و اہل کمال کا بڑا مرکز تھا، جہاں علمی باتوں کے علاوہ شعر و شاعری بھی ہوتی تھی۔ ان علمی مجالس میں شرکت سے مولوی فیض الحسن صاحب کے فکر و نظر میں وسعت پیدا ہوئی، علمی ذوق پختہ ہوا اور سخن فہمی اور سخن شناسی کا ملکہ حاصل ہوا۔

تحصیل علم کے بعد مولوی فیض الحسن دہلی میں طلبہ کو ادب اور طب کی کتابیں پڑھاتے رہے۔ مولانا حالی نے حیات جاوید میں لکھا ہے کہ اسی زمانے میں سرسید احمد خاں نے مولوی فیض الحسن سے حریری کے چند مقامات اور معلقات میں سے چند قصائد پڑھے۔ جب ۱۸۵۷ء میں دہلی میں غدر برپا ہوا تو وہ اپنے وطن سہارنپور چلے آئے اور مریضوں کے علاج معالجے سے دل کو بہلاتے رہے، لیکن بطور طبیب انھیں

کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

سرسید احمد خاں مرحوم کمال کے مردم شناس تھے۔ جوہر قابل کی انہیں تلاش رہتی تھی۔ وہ دہلی میں مولوی فیض الحسن صاحب سے استفادہ کر چکے تھے اور ان کے قدر شناس تھے۔ جب انھوں نے مولوی صاحب کی بیکاری کا حال سنا تو انھوں نے ۱۸۶۴ء میں مولوی صاحب کو سائنٹفک سوسائٹی میں کام کرنے کے لیے غازی پور بلا لیا اور ترجمہ کی خدمت پیش کردی۔ جب سرسید احمد خاں وہاں سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آگئے تو مولانا سہارنپوری بھی ان کے ہمراہ علی گڑھ چلے آئے اور تصنیف و تالیف میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ہمارے ہاں کے بعض بزرگ اہل علم کا بیان ہے کہ سرسید کی شائع کردہ فارسی کتابوں، تاریخ فیروز شاہی اور تزک جہانگیری کی تصحیح و ترتیب اور طباعت و اشاعت زیادہ تر مولوی فیض الحسن کی علمی کاوش کی مرہون منت ہے۔

جب ڈاکٹر لائٹنر (LEITNER) کی سرپرستی میں پنجاب کے لیے ایک مشرقی یونیورسٹی کا منصوبہ تیار ہوا اور علوم مشرقیہ کے لیے اورینٹل کالج کے قیام کا فیصلہ ہوا تو ڈاکٹر لائٹنر نے جو خود مشرقی زبانوں کے فاضل تھے، مولوی فیض الحسن صاحب کو عربی زبان و ادب کی تعلیم کے لیے لاہور بلا لیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ مولوی صاحب سرسید کا سفارشی خط لائے تھے۔ بہرحال وہ ۱۸۷۰ء میں بطور صدر شعبہ عربی اور ناظم ادارہ تحقیق و تصنیف اورینٹل کالج لاہور میں تشریف لے آئے اور سترہ برس تک اس عہدے پر فائز رہے۔ وہ کالج میں ہدایہ کے علاوہ دیوان الحماسہ، دیوان المتنبی اور مقامات حریری پڑھایا کرتے تھے۔

لاہور آکر مولوی فیض الحسن کی علمیت اور ان کی ادب دانی کے جوہر کھلے۔ ان کی

علمی شہرت اور تدریسی قوت کی وجہ سے یو۔ پی، بہار، ریاست ہائے راجپوتانہ اور حیدرآباد (دکن) تک سے طلبہ لاہور کھنچے چلے آتے تھے۔ وہ خارج از اوقات کالج طلبہ کو دیوان الحماسہ پڑھایا کرتے تھے۔ ان طلبہ میں مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولوی فیض الحسن صاحب کالج کے ماہوار عربی رسالہ شفاء الصدور میں بھی مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان کی تحریک و ترغیب سے ان کے شاگردوں میں عربی تحریر و انشا کا ذوق پیدا ہوا۔ قیام لاہور کے دوران مولوی صاحب مطب بھی کیا کرتے تھے اور چھٹیوں میں سہارن پور جا کر مدرسہ مظاہر العلوم کے حسابات کی پڑتال بھی کیا کرتے تھے بلکہ دور دراز مقامات پر جا کر مدرسہ کے لیے چندہ بھی جمع کیا کرتے تھے۔ کالج کے زمانے میں انہوں نے ڈاکٹر لائٹنر کو سنین اسلام جو مسلمانوں کی سیاسی و علمی تاریخ ہے کی تالیف میں مدد کی۔ حکومت نے مولوی صاحب کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا۔

مولوی فیض الحسن صاحب سادہ مزاج مگر ظریف، بذلہ سنج، حاضر جواب اور باغ و بہار طبیعت کے آدمی تھے۔ کالج میں مشہور انشا پرداز اور ادیب مولوی محمد حسین آزاد سے ان کی نوک جھونک رہتی تھی۔ مولوی صاحب کٹر حنفی تھے اور مولوی محمد حسین آزاد اثنا عشری۔ ان دونوں کی باہمی چھیڑ چھاڑ کے واقعات اور ایک دوسرے کے لطائف و ظرائف لاہور کے پرانے علماء کو یاد تھے۔ مولوی صاحب فتویٰ نویسی سے ہمیشہ گریزاں بلکہ نفور رہے۔ انہوں نے اچانک ۶ر فروری ۱۸۸۷ء کو لاہور میں انتقال کیا اور ان کی میت کو ان کی وصیت کے مطابق سہارن پور لے جا کر دفن کیا گیا۔ ان کی وفات پر مولانا شبلیؒ نے ایک درد انگیز مرثیہ لکھا۔ مولوی فیض الحسن صاحب

کو ذات پاک رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ وہ شب جمعہ کو ساری رات جاگ کر درود شریف پڑھا کرتے تھے اور جس تخت پر بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے ان کی وفات کے بعد بھی اس میں سے ایک عرصہ تک خوشبو آتی رہی۔

علم و فضل

مولوی فیض الحسن عربی زبان کے فطری ادیب تھے۔ عربیت کا ذوق انکے گوشت پوست اور دل و دماغ میں رچا بسا ہوا تھا۔ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ مرحوم وہ اپنے زمانے کے ابو عبیدہ اور اصمعی تھے۔ فیروزآبادی کی قاموس المحیط کے حافظ تھے۔ کتاب الاغانی کی روایات انہیں ازبر تھیں۔ عربی لغت کے علاوہ ایام عرب اور انساب عرب سے جیسی انہیں واقفیت تھی ویسی کم تر کسی معاصر ادیب کو حاصل ہوگی۔ جاہلی عربوں کے رسوم و رواج اور عادات و خصائل پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے حیات شبلی میں لکھا ہے "مولانا فیض الحسن کا سب سے بڑا فیض قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی نکتہ شناسی تھا۔ وہ اسی اصول سے قرآن پاک کا بامحاورہ ترجمہ اپنے خاص طلبہ کو پڑھاتے اور سمجھاتے تھے"۔ لاہور میں بعض اہل علم بتلاتے ہیں کہ جب مولوی صاحب قرآن پاک کی یہ آیت۔ وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ ..... الظَّالِمِينَ ۝ (سورہ ہود: ۴۴) پڑھتے تھے تو ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ قرآن، موضح القرآن کے بے حد مداح اور قدردان تھے اور دیوان الحماسہ کے بعد اسے سبقاً سبقاً پڑھایا کرتے تھے۔ اعجاز القرآن کا یہی ذوق انکے شاگردوں، مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ اور ان کے تلامذہ تک کو منتقل ہوا۔

شاعری

مولانا فیض الحسن اردو، فارسی اور عربی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ مولوی

صدر الدین آزردہ کی صحبتوں میں رہ کر انہیں شعر و سخن کا شوق ہو گیا تھا۔ ان کا اردو کلام گلزار فیض اور فارسی دیوان نسیم فیض کے نام سے ان کے خلف الرشید مولوی رشید احمد نے چھپوایا تھا۔ ان کا اردو اور فارسی کلام پرانی طرز کا ہے اور اس میں کوئی خاص جدت اور ندرت نہیں۔ بیشتر قصائد حمد و نعت کے علاوہ حاکمان وقت اور روسائے ملک کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔

مولوی فیض الحسن کی ادبی شہرت کا ضامن ان کا عربی کلام ہے جسے مولانا حمید الدین فراہیؒ نے دیوان الفیض کے نام سے مرتب کر کے حیدرآباد (دکن) سے ۱۳۲۲ھ میں شایع کیا تھا۔ ان کی شاعری کا موضوع حمد، نعت، مراثی اور مدح وغیرہ ہیں۔ مولانا نے ان قصائد میں شعرائے جاہلیت کا تتبع کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک زمانۂ جاہلیت کی شاعری ہی عربی شاعری کی معراج ہے۔ ان قصائد میں سب سے پہلے محبوبہ کے فراق اور اس کی فرودگاہ کے شکستہ آثار کا ذکر ہے اور اس کے بعد تشبیب آتی ہے۔ مدحیہ قصائد نواب شاہ جہاں بیگم، نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) اور نواب کلب علی خاں (رامپور) اور سلطان عبد المجید خان (ترکی) کے نام ہیں۔ انھوں نے اپنی والدہ، مولوی احمد علی محدث سہارنپوری اور مولوی فضل حق خیرآبادی کے بھی مرثیے لکھے ہیں۔ ان قصائد سے مولانا کی حیرت انگیز قادر الکلامی اور عربی کے محاوروں اور ان کی ترکیبوں پر اہل زبان جیسی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ لاہور آکر مولانا کو عزت ملی، شہرت ملی اور انھیں ہر طرح کی آسودہ حالی اور فارغ البالی نصیب ہوئی۔ لیکن وہ لاہور میں رہتے ہوئے اپنی غریب الوطنی اور مسافرت کی شکایت کرتے رہے۔ دہلی کی یاد تو

انھیں ہمیشہ ستاتی رہی۔ وہ اہل لاہور سے کچھ ناخوش نظر آتے ہیں۔

مولانا فیض الحسن نے عربی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ضوء المشکوٰۃ۔ مشکوٰۃ المصابیح کا ایک لغوی اور نحوی حاشیہ، جو ابھی تک شایع نہیں ہو سکا۔ قلمی نسخہ ٹونک میں ہے۔

۲۔ تعلیقات الجلالین۔ امام سیوطی کی مختصر مگر مشہور عالم تفسیر الجلالین میں وارد مشکل مفردات اور تراکیب کو بحسن و خوبی حل کیا ہے (طبع علی گڑھ، ۱۸۷۰ء)

۳۔ دیوان حسانؓ بن ثابت۔ یہ دیوان مولانا فیض الحسن نے ڈاکٹر لائٹنر کی فرمائش سے ۱۸۷۸ء میں لاہور سے شایع کیا تھا۔ ایام عرب کی تفصیل کے ساتھ کتاب کے دائیں اور بائیں تشریحی حواشی ہیں۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی نہایت ردی اور خراب ہے۔

۴۔ حل ابیات بیضاوی: امام بیضاوی نے اپنی مشہور عالم تفسیر انوار التنزیل و اسرار التاویل میں قرآن پاک کے معانی کی تشریح کی تائید میں کلام عرب سے شواہد پیش کیے ہیں۔ مولوی فیض الحسن صاحب نے ان شواہد کی تشریح و توضیح کی ہے۔ ایک سو بیس صفحات کا یہ مفید رسالہ ۱۲۷۰ھ میں دہلی سے شایع ہوا۔

۵۔ ریاض الفیض: سبع معلقات کی تین زبانوں، یعنی عربی، فارسی اور اردو میں مفید شرح۔ مولوی فیض الحسن صاحب شعر لکھ کر بحر و قافیہ کا ذکر کرتے ہیں شاعر کا حسب و نسب بیان کرتے ہیں۔ مفردات کی صرفی و نحوی تشریح کرتے ہیں۔ شعر کا سلیس عربی میں ترجمہ کرتے ہیں اور عربوں کے رسوم و رواج پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اردو ترجمہ کی زبان پرانی بلکہ مخل مطلب ہے۔ یہ شرح

۱۸۸۲ء میں لاہور سے شایع ہوئی تھی۔

۶- الفیضی: شرح دیوان الحماسہ، زمانہ جاہلیت اور عہد اسلام کے منتخبہ قصائد اور ان کے مقطوعات مختلف فضلا نے مختلف زبانوں میں جمع کیے تھے، لیکن جو شہرت اور مقبولیت ابو تمام (م ۲۳۱ھ) کے منتخبہ قصائد یعنی دیوان الحماسہ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوسکی۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر تقریباً تیس بتیس کے قریب فضلا نے مختلف اوقات میں اس دیوان کی شرحیں لکھی ہیں، جن میں ابن جنی[1]، مرزوقی[2] اور خطیب تبریزی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مولانا فیض الحسن صاحب کا سب سے بڑا فیض یہ ہے کہ انھوں نے دیوان الحماسہ کو عربی زبان کے نصاب میں شامل کیا اس کی تعلیم و تدریس کے لیے خود کو وقف کر دیا اور ہندوستانی طلبہ کی سہولت کے لیے آسان عربی زبان میں الفیضی کے نام سے شرح لکھ دی۔ ان سے قبل مشہور المانوی مستشرق فریتاغ (FREYTAG) شرح تبریزی کو ۱۸۲۸ء میں لاطینی ترجمہ کے ساتھ بون (جرمنی) سے شایع کر چکا تھا۔ مولوی فیض الحسن کی شرح کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں:

وہ ہر شاعر کا پورا نام مع حسب و نسب بیان کرتے ہیں، ہر شعر کے ساتھ اس کا قافیہ بھی لکھ دیتے ہیں۔ شعر سے وابستہ واقعہ کا پس منظر بیان کرتے ہیں، مفردات کی عربی میں خوب تشریح کرتے ہیں، سلیس عربی میں شعر کا مطلب لکھ دیتے ہیں اور تبریزی کی غلطیوں کی تصحیح بھی کرتے جاتے ہیں۔ یہ شرح لکھتے وقت ان کے پیش نظر زیادہ تر فیروز آبادی کی قاموس المحیط، کتاب الاغانی، ابن خلکان کے علاوہ زمخشری

[1] و [2] ابن جنی اور مرزوقی کی شرحیں مصر سے چھپ کر شایع ہو چکی ہیں۔

کی الفائق وغیرہ کتابیں رہی ہیں۔ اردو اور عربی میں مولوی ذوالفقار علی اور مولوی اعزاز علی کی شرحیں کم و بیش الفیضی سے ماخوذ ہیں۔

افسوس ہے کہ یہ شرح جو ۱۸۷۷ء میں مطبع نولکشور، لکھنؤ سے فارسی رسم الخط میں شایع ہوئی اغلاط سے پر ہے۔ متن کا آدھا شعر اوپر کی سطر اور آدھا نچلی سطر میں ہے اشعار بلا اعراب ہیں پروف ریڈنگ کی طرف کسی نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ فارسی رسم الخط میں چھپنے کی وجہ سے عرب ممالک کے علمی حلقوں میں اس کی زیادہ پذیرائی نہ ہوسکی۔ مولوی صاحب نے مندرجہ بالا کتب کے علاوہ حدیث ام زرع (سات سہیلیوں کی کہانیاں) اور قاموس المحیط کے خطبے کی عربی میں شرحیں بھی لکھی ہیں۔

مولانا فیض الحسن سے سینکڑوں طلبہ نے استفادہ کیا، ان میں ممتاز ترین سر سید احمد خاںؒ، مولانا شبلیؒ، مولانا حمید الدین فراہیؒ، مفتی عبد اللہ ٹونکیؒ، مولوی ظفر الدین لاہوری اور مولوی اصغر علی روحی (سابق پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور) ہیں۔

مولوی فیض الحسن صاحب کے جستہ جستہ حالات بعض کتابوں اور رسالوں میں ملتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مولوی سعید اقبال قریشی، استاد عربی اسلامیہ کالج سول لائینز لاہور نے مولوی صاحب کے علمی و ادبی کارناموں پر ایک مبسوط مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ہے۔ بعض واقعات کی تفصیل اور سنین کی تعیین میں اس مقالے سے بڑی مدد ملی ہے جس کا اعتراف واجب ہے۔

علّامہ اقبال کا پی، ایچ، ڈی کا مقالہ

مترجمہ جناب ابوسفیان اصلاحی شعبۂ عربی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

ایک طالب علم کی حیثیت سے علامہ اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی میں درجات عالیہ میں داخلہ لیا اور وہاں سے ڈگری حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جو مقالہ لکھا اسی کو کسی قدر ردوبدل کے بعد میونخ یونیورسٹی میں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے لیے جمع کیا' جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی گئی۔ اس مضمون میں علامہ اقبال کے اسی تحقیقی مقالہ سے متعلق کچھ نئی اور دلچسپ چیزیں پیش کی جائیں گی۔

کیمبرج اور میونخ یونیورسٹی کے مراحل سے گذرنے کے بعد یہ مقالہ کتابی صورت میں شایع ہوا، ان سب مرحلوں میں اس کا نام "The Development of Metaphysics in Persia" ہی رہا، مگر جس وقت علامہ اقبال نے کیمبرج میں رجسٹریشن کی درخواست دی تھی اس وقت اس کا نام کسی قدر مختلف تھا یہ درخواست ستمبر ۱۹۰۵ء میں مٹرنیٹی کالج کے سینیر ٹیوٹر کو دی گئی تھی، اس درخواست میں تحقیقی مقالے کے عنوان کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں[1]:

---

[1] زیر نظر مقالہ پروفیسر محمد صدیق شبلی کی کدوکاوش کا نتیجہ ہے، جو پاکستان کے موقر سہ ماہی رسالہ اقبال ریویو لاہور میں اپریل۔ جون ۱۹۸۹ء میں شایع ہوا تھا۔

"میں نے عربی۔ فارسی اور یوروپین فلسفہ کا مطالعہ بارہ[12] برس قبل شروع کیا تھا، اس مطالعہ نے مجھے اس نتیجہ تک پہونچایا کہ میں اسلامی فلسفہ کے بارے میں اہل مغرب کی معلومات میں اضافہ کرسکتا ہوں۔ چنانچہ اپنی تحقیق کے لیے "ایران میں مابعد الطبیعات تصورات کی ابتدا اور ارتقار" کا عنوان تجویز کرتا ہوں یا عرب فلسفہ کے سلسلے میں کوئی کام جسے یونیورسٹی منظور کرسکے"۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اولاً علامہ اقبال نے اپنے مقالہ کا عنوان "The Genesis and Development of Metaphysical Concepts in Persia" تجویز کیا تھا۔ جس کو بعد میں غالباً انھوں نے اپنے اساتذہ کے مشورے سے تبدیل کرکے "The Development of Metaphysics IN PERSIA" کردیا۔

میونخ یونیورسٹی کے آرکایوز میں اقبال کی تھیسس سے متعلق چند اہم کاغذات دستیاب ہوئے ہیں، جن سے اس کے بارے میں بعض اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان دستاویزوں کی دریافت کا سہرا ڈاکٹر درانی کے سر ہے، جنھوں نے سنہ ۱۹۸۶ء میں پہلی بار ان پر ایک مضمون تحریر کیا تھا، لیکن ابھی تک ان دستاویزوں سے پورے طور پر استفادہ نہیں کیا جاسکا ہے، کیونکہ یہ پرانے انداز اور جرمن زبان میں ہونے کی بنا پر بہت واضح نہیں ہیں۔ راقم الحروف نے سنہ ۱۹۸۳ء میں ہیڈبرگ یونیورسٹی میں اپنے قیام کے دوران کچھ جرمن احباب کی مدد سے ان دستاویزوں کو نقل کراکے ان کا ترجمہ کرایا تھا۔

علامہ اقبال کا یہ تحقیقی مقالہ پہلی بار Luzar - Co., London سے

۱۹۰۸ء میں شایع ہوا۔ جرمنی کی یونیورسٹی لائبریری میں موجود اس ایڈیشن کے سرورق پر یہ تشریحی کلمات درج ہیں[۲]۔

" Inaugural - Dissertation

Philosaphischen Der Faculty Sekt I (Resp II)

Ludwig Maximiliana - Universital, Munchen"

لیکن دوسرے نسخوں میں یہ تشریح موجود نہیں ہے۔ سرورق کے اندراجات میں اختلاف کے باعث بعض محققین کا خیال ہے کہ دراصل ۱۹۰۸ء میں اس کے دو ایڈیشن شایع ہوئے[۳]۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۸ء میں ایک ہی ایڈیشن دو مختلف سرورق کے ساتھ منظر عام پر آیا تھا، جن نسخوں پر یہ تشریحی کلمات موجود تھے، انھیں یونیورسٹی میں جمع کیا گیا، کیونکہ یہ یونیورسٹی کے ضوابط کے تحت ضروری تھا اس سلسلہ میں ضابطہ کی تفصیل درج ذیل ہے[۴]۔

"امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد امیدوار اپنے مقالہ کو ممکنہ حد تک فیکلٹی کے تجویز کردہ اضافہ و ترمیم کے بعد شایع کرے گا، نیز اس کے ساتھ اصل مقالہ بھی منسلک کیا جائے گا۔ مقالہ کے سرورق پر مندرجۂ ذیل عبارت واضح طور پر تحریر کی جائے گی۔

"Inagural Dissertation der Phileesophischen

Fakultat saket I der Luwing. Maximilian

Universatat Munchen

(Inaugural Dissertation of tho Philosphical

Faculty Section of the Luwing Maximlian

University Munich)

مطبوعہ مقالہ کی ۱۵۰ کاپیاں جمع کرنے کے بعد مصنف کو ڈاکٹریٹ کی سند دی جاتی ہے جو لاطینی زبان میں ہوتی ہے اور اس پر ڈین کے دستخط کے علاوہ فیکلٹی اور یونیورسٹی کی مہر ثبت ہوتی ہے اور امتحان کی تاریخ بھی درج ہوتی ہے"۔

اس صراحت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کچھ مطبوعہ کاپیوں پر تشریحی کلمات اور فیکلٹی اور یونیورسٹی کا پورا پورا نام کیوں لکھا ہوا ہے۔

اقبال کے امتحان کا جو ریکارڈ میونخ یونیورسٹی میں محفوظ ہے، اس سے بڑی دلچسپ اور مفید باتوں کا علم ہوتا ہے۔

فلاسفی فیکلٹی کے اول سکشن نے ۲۱ جولائی ۱۹۰۷ء کو فیکلٹی کے سربرآوردہ پروفیسروں کو اقبال کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے ممتحن کی حیثیت سے مدعو کیا تھا[۵]، مدعوین میں اون ہرٹ لنگ، پروفیسر الیف ہومل اور لپ شامل تھے۔ اس ریکارڈ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اقبال نے اپنا اصل موضوع فلسفہ کو بنایا تھا مشرقی اور مغربی فلسفہ ان کے جزوی موضوع رہے اس سے جرمنی میں اقبال کی آمد کی تاریخ کی تعین بھی کسی حد تک ہو جاتی ہے، بیگم عطیہ فیضی کے بیان سے لندن میں ۱۶ جولائی ۱۹۰۷ء تک ان کا قیام ثابت ہے[٦]، قرین قیاس ہے کہ وہ ۱۷ سے ۲۰ جولائی کے درمیان جرمنی پہونچے ہوں گے، اقبال نے ۲۶۰ مارک بطور امتحان فیس کے ۲۲ جولائی کو جمع کیے۔ اس کی رسید ریکارڈ میں موجود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اقبال کو میونخ یونیورسٹی سے واقفیت انگلینڈ کے اپنے اساتذہ کے

ذریعہ ہوئی، ممتحنین میں پروفیسر آرنلڈ کے نام سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید انھوں نے
پی۔ ایچ۔ ڈی میں اقبال کے داخلہ کے سلسلہ میں ان کی مدد کی ہوگی، پہلے آرنلڈ نے
تھیسس کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کی، اقبال کے جرمن نگراں پروفیسر ہومل نے آرنلڈ
کی رپورٹ سے ایک اقتباس پیش کیا ہے جو درج ذیل ہے[۸]

"میں نے اقبال کے مقالہ " The Development of Metaphyicts
in Persia " کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا میری معلومات کی حد تک قدیم ایرانی تفکر
کے وہ عناصر جو اسلامی فلسفہ کا ایک حصہ بن کر باقی رہ گئے انکے عہد بعہد ارتقاء کی چھان
بین اور فکر اسلامی کے ان ادوار کی معلومات کی شناخت کی جائے جن کا مزاج واضح طور
پر ایرانی ہے۔

مصنف نے اس میں بہت کچھ ایسا مواد جمع کیا ہے جس سے یورپ والے بھی کم ہی واقف
تھے۔ یہ مقالہ تاریخ فلسفہ اسلامی میں ایک گرانقدر اضافہ ہے[۸]

پروفیسر ہومل نے بھی مقالہ کے اعلیٰ معیار کی تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ اس مقالہ
کے ساتھ واقعی انصاف تو گولڈ زیہر یا میکس ملرس جیسے فضلاء ہی کرسکتے تھے[۹]۔ ہومل ازراہ
خاکساری اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتے، اپنی رپورٹ کے آخر میں وہ زبانی امتحان
کی تجویز بھی پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر لٹلنگ نے بھی اس مقالہ کے معیار تحقیق کو سراہا ہے، وہ محسوس
کرتے ہیں کہ یہ مقالہ ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جس کا مطالعہ بہت وسیع ہے لیکن
ان کا خیال ہے کہ فیکلٹی کی اجازت سے قبل زبانی امتحان کا اہتمام ممکن نہیں ہے پروفیسر
لپ اور پروفیسر کون نے بھی اس مقالہ کے بارے میں اپنے رفقاء کی آراء سے

مکمل طور پر اتفاق کیا ہے، پروفیسر کون نے یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال، ا نومبر ۱۹۰۷ء تک
انگلینڈ لوٹ جانا چاہتے ہیں اس طرح گویا وہ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ
ا نومبر تک زبانی امتحان ہوجائے، چنانچہ فیکلٹی نے اس امتحان کی اجازت دیدی۔

اقبال کا زبانی امتحان ۴ نومبر ۱۹۰۷ء کو (۵ بجے سہ پہر) سینیٹ چیمبر میں
ہوا[۱۰]۔ ممتحن کا بورڈ درج ذیل حضرات پر مشتمل تھا،

فیکلٹی کے پروفیسر (۱) پروفیسر ایف ہومل (۲) پروفیسر لپ (۳) پروفیسر
شنگ (۴) پروفیسر کون اور ڈین آف فیکلٹی پروفیسر ڈاکٹر ایچ برمین۔

اس زبانی امتحان میں اقبال کو کامیاب قرار دیا گیا، فیکلٹی کے ڈین نے اسی
دن امتحان کی تکمیل کے بعد ہی اقبال کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کرنے کے
سلسلہ میں Royal Rectorate of the University کو تجویز بھیج دی[۱۱]۔

اقبال کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ عرصہ سے بحث و نزاع کا موضوع بنا ہوا
ہے اس کا سبب وہ تاریخ پیدائش بھی ہے جو اقبال نے خود اپنے مقالہ میں لکھی ہے
انھوں نے اس میں اپنی تاریخ پیدائش ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء لکھی ہے
دراصل سن ہجری کو سن عیسوی کے مطابق بنانے میں ان سے غلطی ہوئی، ۳ ذیقعدہ
۱۲۹۴ھ کو عیسوی تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بنتی ہے ۱۹۵۸ء میں اس غلطی کا انکشاف
جان مارک نے کیا[۱۲]۔ انھوں نے ان محققین کے نام بھی بتائے ہیں جنھوں نے اقبال کی
تاریخ پیدائش ۱۸۷۷ء تحریر کی ہے۔ اس صورت حال کے باعث حکومت پاکستان
کو اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش متعین کرنے کے لیے ایک کمیشن بٹھانے کی ضرورت
محسوس ہوئی جو اس نتیجہ پر پہنچا کہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے لیکن

جرمنی میں اس غلطی کی اصلاح ابھی کچھ دنوں پہلے ہوئی ہے۔[13] جرمنی میں لکھے جانے والے
تحقیقی مقالات سے متعلق ۱۹۷۸ء کی The Year Book میں اقبال کی صحیح
تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء درج ہے لیکن شمل اور ماریک اور بعض دوسرے
محققین کی توجہ اس طرف نہیں ہوئی۔

اقبال نے پہلے اپنے مقالہ کی ٹائپ شدہ کاپیاں جمع کیں۔ اس کے بعد
اندروئے قانون مطبوعہ کاپیاں جمع کیں[14]۔ متعلقہ دفعہ کی تفصیل یہ ہے۔

"جو مقالہ جمع کیا جائے وہ اس صورت میں ہونا چاہیے کہ طباعت کے لیے
دیا جا سکے اور صاف ستھرا لکھا ہو تاکہ متعلقہ شعبہ اس کی جانچ کر سکے۔ مطبوعہ
مقالہ کی ۱۵۰ کاپیاں ایک سال کے اندر جمع کر دینی چاہئیں۔"[15]

اقبال کے مقالہ کی اصل ٹائپ شدہ کاپی اقبال کی صد سالہ تقریبات کے موقع
پر حکومت ہند کو بطور تحفہ دی گئی، اب صورت حال یہ ہے کہ وہ نسخہ نہ تو ہندوستان
میں دستیاب ہے اور نہ جرمنی میں۔ میونخ یونیورسٹی لائبریری میں اس کی جگہ پر
ایک مطبوعہ نسخہ رکھ دیا گیا ہے، کیٹلاگ میں موجود تھیسس کے کارڈ
پر یہ لکھا ہوا ہے:[16]

" دسمبر ۱۹۶۹ء میں اس کتاب کا اصل نسخہ Bavarian staall
Bioilbiotkoken کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر ہنس اسٹڈیڈل کی
معرفت The Bavarian Staall Skanzklei کے حوالہ کیا
گیا، جس نے اس کتاب کو اقبال صدی کی تقریبات کے موقع پر حکومت ہند
کو بطور تحفہ پیش کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ کہا جاتا تھا کہ یہ کتاب ہندوستان میں

دستیاب نہیں ہے"۔

پاکستان کے لیے یہ نہایت افسوسناک خبر ہے لیکن اقبال کے شیدائیوں
کی تسکین قلب کے لیے چند محققین نے یہ دعویٰ کیا کہ صرف مطبوعہ نسخہ ہی یونیورسٹی
میں جمع کیا گیا تھا۔ اس لیے لائبریری سے اقبال کی اصل تھیسس کے غائب ہو جانے
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن درج ذیل اقتباس سے اس دعویٰ کی واضح طور پر
تردید ہوتی ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس میں صداقت کا شائبہ نہیں ہے۔

"عطیہ نے اقبال پر اپنی تصنیف میں جو ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی یہ لکھا تھا کہ
اقبال کی تھیسس کا ترجمہ جرمن زبان میں شائع کیا گیا۔[17] لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس
کتاب کی اشاعت کے ایک زمانہ بعد تک بھی وہ شائع نہ ہو سکی تھی، ڈاکٹر درانی کا
کہنا ہے کہ جرمن ترجمہ ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے موقع پر ایک یادگار کے طور پر
مکمل کیا گیا، لیکن یہ اطلاع بھی درست نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی تھیسس کا
پہلا جرمن ترجمہ ایک ایرانی اسکالر علی رضا امیر نے ڈاکٹر اے۔ ایم شمل کے تعاون
سے کیا اور اسے ۱۹۸۲ء میں مغربی جرمنی کے Hafiz Verleg Bcnn
نے شائع کیا۔"

حواشی

۱؎ اقبال کی درخواست جسے انھوں نے ۱۹۰۵ء میں "سینیر ٹیوٹر ٹرنیٹی کالج کیمبرج کو دیا تھا۔
۲؎ ایس، ایم اقبال The Development of Metaphysics in Persia
میونخ یونیورسٹی میں محفوظ ہے ۳؎ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ تصانیف اقبال۔ اقبال اکیڈمی۔

لاہور۔ ۱۹۸۲ء ۳؎ میونخ یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مستقل احکام، نمبر ۶ اور ۷
۵؎ اقبال کے امتحان کا ریکارڈ، ص ۱ ۶؎ عطیہ بیگم اقبال لاہور۔ ۱۹۶۹ء۔ ص ۲۱۔ ۷؎
آرنلڈ تھامس۔ ای۔ آر، بی۔ ص ۲ ۸؎ ایف ہوئل، ایضاً ۹؎ ای، آر پرٹلنگ۔ ص ۳
۱۰؎ ایضاً ص ۴ ۱۱؎ ایضاً ص ۵ ۱۲؎ جان مارک۔ محمد اقبال کی تاریخ پیدائش Archive
Orientalmi Noklladatelstics Leskoelovenske Akademic.
۱۳؎ Johres Verzeichmisder on den Dautschen Universi
taten erschienenen Schriften, Berlin 1909, P-544
۱۴؎ مستقل، ۲ بی ۱۵؎ ایضاً، نمبر ۷ ۱۶؎ میونخ یونیورسٹی لائبریری کارڈ نمبر۔ ۳۱۵۰
۱۷؎ عطیہ۔ ص ۲۲۔

دار المصنفین کی بعض مطبوعات کے جدید اڈیشن

دار المصنفین کی بعض کتابیں عرصہ سے کمیاب تھیں اب مندرجۂ ذیل کتابوں کے نئے ایڈیشن چھپ کر تیار ہیں:۔

۱۔ **مقالات شبلی** جلد ہفتم، مولانا شبلی نعمانیؒ کے فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت:۔ ۲۰/

۲۔ **اسوۂ صحابہؓ** حصہ دوم، از مولانا عبدالسلام ندویؒ، اس میں حضرات صحابہؓ اور صحابیاتؓ کی سیاسی، مذہبی اور علمی خدمات کی تفصیل ہے۔ قیمت:۔ ۴۵/

۳۔ **گل رعنا**:۔ از مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ، اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اردو شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے باکمال اردو شعراء کا تذکرہ، ابتدا میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا پیش لفظ بھی ہے قیمت ۶۰/

۴۔ **دین رحمت**:۔ از شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم، اس میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام بلا تفریق مذہب و ملت اور دوست و دشمن سارے انسانی طبقوں بلکہ پوری کائنات کے لیے سراسر عدل و رحمت ہے، قیمت:۔ ۴۰/

تاریخ ہند کا ایک مخطوطہ

از

جناب ریاض الدین خاں صاحب ٹونک، راجستھان۔

عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک کے نادر و نایاب ذخیرہ میں چہار گلشن یا اخبار النوادر کے چار نسخے موجود ہیں ان میں سے دو اودے پور ایک الور اور ایک ٹونک کے کتب خانہ سے یہاں منتقل کیے گئے ہیں۔ اس مضمون میں پہلے ان چاروں کے متعلق ضروری تفصیل پیش کی جائے گی اور آخر میں سعیدیہ لائبریری ٹونک سے منتقل ہو کر آنے والے نسخہ کے بارے میں مفصل بحث کی جائے گی۔

پہلا مخطوطہ چہار گلشن (محمد شاہی) یا اخبار النوادر اودے پور کی وکٹوریہ لائبریری کا ہے، اس کا ایکسیشن نمبر ۱۱۲۶ ہے یہ ۱۰۸ اوراق پر مشتمل ہے، ہر صفحہ کی سطروں کی تعداد ۱۶ ہے، اس کا سائز ۲۱ × ۳۲ سینٹی میٹر اور خط نستعلیق ہے۔ اس مخطوطہ میں پانڈوؤں[1] کے عہد سے لے کر ۱۱۷۳ھ تک کی ہندوستان کی تاریخ درج ہے۔

۱؎ یدھشٹر پانڈوں کا سب سے بڑا بیٹا تھا یہ کنتی کے بطن اور دھرم کے نطفہ سے تھا، اس کی اور اس کے بھائیوں کی پرورش دھرت راشٹر کے بیٹوں کیساتھ ہوئی تھی دھرت راشٹر (بقیہ حاشیہ ص ۲۱۸ پر)

اس کے کاتب سید شوکت حسین المعروف یعقوب حسین دیوبندی نے اسے ۵ محرم الحرام ۱۲۰۲ھ میں نقل کیا ہے۔ یہ مکمل نسخہ ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ اس میں چہار گلشن ہیں۔

گلشن اول در احوال بادشاہان ہندوستان میں ہندوستان کے فرمانروا حکمراں کے حالات مختلف صوبوں، قلعوں اور مشہور و مقدس جگہوں وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

دوسرا گلشن بیان صوبہ جات جنوبستان ہے اس میں دکن کے بادشاہوں مقدس مقامات، قلعوں، پیداوار، آب و ہوا، رسم و رواج قلعوں، ندیوں اور کانوں وغیرہ کا ذکر ہے۔

گلشن اول و دوم میں ہندوستان اور جنوبستان کے صوبوں کی سرکاروں کی سالانہ آمدنی اور زمین کے رقبہ وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔

تیسرا گلشن در مسافات و منازل چہار سو شاہ جہاں آباد دہلی کے نام سے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۷) نے اسے یوراج بنایا اس پر اس کے چچا بہت برہم ہوئے ان کی شدید مخالفت کی وجہ سے پانڈوؤں کو بارہ برس کے لیے بن واس اختیار کرنا پڑا۔ اس عرصہ میں ان کی شادی دروپدی سے ہوگئی اور بارہ برس گزرنے پر پانڈوؤں نے اندرپرستھ آباد کیا اور یدھشٹر کو راجہ بنایا۔ مگر دھرت راشٹر کے بڑے بیٹے دریودھن نے پانڈوؤں، دروپدی اور ان کی سلطنت کو جوئے میں جیت لیا جب دھرت راشٹر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے فیصلہ کیا کہ پانڈو پھر ۱۳ برس کیلئے بن باس اختیار کریں۔ یہ وقت گزرنے پر بھی دریودھن نے سلطنت واپس کرنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ اس بارے میں کرشن جی کی کوششیں بھی بیکار گئیں اور دریودھن نے انکی بات بھی نہ مانی اس پر جنگ مہابھارت ہوئی جس میں دریودھن اور اسکے رشتہ دار قتل ہوئے۔ یدھشٹر راجہ بنا۔ کرشن جی کی وفات کے بعد پریکشت کو جو ابھی منیو کا بیٹا تھا تخت پر بٹھا کر پانچوں پانڈو کوہ ہمالہ پر چلے گئے جہاں سے وہ سورگ میں پہنچ گئے۔

ہے اس میں بیجاپور، اورنگ آباد، برہان پور، اجین، بہرائچ، آگرہ، لاہور، اٹک، کابل، کشمیر، ملتان، اجمیر، گجرات، احمد آباد، بھکر، الہ آباد، پٹنہ اور لکھنؤ وغیرہ تک کی منزلیں مرقوم ہیں، مصنف نے اپنے طور پر نقشے اور خاکے بنا کر ندیوں، پلوں، سرایوں، گھاٹیوں، قصبوں اور شہروں کے نام بھی واضح کر دیے ہیں۔

چوتھا گلشن در ذکر سلاسل، فقرا، درویشان اسلام و ہنود ہے اس میں مسلمان صوفیوں کے سلسلے کے شیوخ کے نام حالات زندگی اور فلسفہ و مسلک کی تشریح کے ساتھ ہندو درویشوں کا بھی تذکرہ ہے۔

اس مخطوطہ کی ابتدا و تتمہ ذیل میں درج ہے :۔

ابتدا :۔ "سپاس بیرون از قیاس بادشاہی را سزد کہ ...... آہ

تتمہ :۔ بعد ایں کتاب بفاصلۂ یک ہفتہ بعالم جاودانی شتافتند

ریو کی فہرست میں گلشن کے بجائے چمن لکھا ہے (ملاحظہ ہو ص ۹۵۹)۔ سر جدوناتھ سرکار نے "اورنگ زیب کا ہندوستان" میں چہار گلشن کے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا ہے اور ایلیٹ نے اپنی کتاب "ہسٹری آف انڈیا" میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔

یہ کتاب دہلی پر احمد شاہ ابدالی کے دوسرے حملہ کے وقت وزیر غازی الدین خاں کی ایما سے فارسی زبان میں لکھی گئی۔

دوسرا مخطوطہ بنام چہار گلشن سرکاری کتب خانہ الور سے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں منتقل ہوا ہے اس کا اکسیشن نمبر ۳۴۰۹ ہے، اس میں ایک سو اسی صفحات اور ہر صفحہ میں اٹھارہ سطور ہیں۔

اس کا سائز ۱۸ × ۳۰ سنٹی میٹر ہے اور خط نستعلیق ہے۔ یہ اچھی حالت میں ہے۔ اس

مخطوط میں مندرجۂ ذیل تین مہریں درج ہیں۔

ا۔ ایک مہر گول اور اردو میں ہے جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے بالائی حصہ پر شری لونی رام جی اور ذیلی حصہ پر کتب خانہ سرکار الور۔ کندہ ہے۔

شری لونی رام جی

کتب خانہ سرکار الور

ب۔ دوسری مہر بھی گول ہے اس میں صرف سرکاری کالج الور ہندی زبان میں کندہ ہے۔

ت۔ تیسری مہر گول ہے اور اس کا سائز مندرجہ بالا مہروں سے بڑا ہے۔

اس کتاب کی اول اور آخر کی عبارت اس طرح ہے۔

اول :۔ چوں راجہ جودشٹر از کار دنیا . . . .

آخر :۔ ایں کتاب تواریخ اخبار الاخیار محتوی . . . . . در شن سلاسل فقراللہ تمام شد

تیسرا مخطوطہ بھی اودے پور کا ہے۔ اس کو مولف دیا ناتھ نے ۱۸۱۲ء/۱۲۲۷ھ میں لکھا ہے۔ اس میں صرف ۱۳ صفحات ہیں اور ہر صفحہ پر ۱۳ سطور ہیں۔ اس پر تواریخ اخبار راجہ یودھشٹر، مصنفہ لالہ سیس رام ۱۲۲۷ھ درج ہے اس کا ایکسیشن نمبر ۲۶۲۶/۲ ہے۔ اس کتاب کی اول و آخر عبارت یہ ہے۔

اول :۔ از عنایت اخروی و تفصیلات سرمدی چوں از بشنوید احوال بادشاہان

آخر :۔ احوال بسبب دو صوبہ ہندوستان کہ معرضہ تصرف بادشاہان . . . . اکبر بادشاہ غازی بسنہ ۶ الٰہی بیا مرزا ایں برسر را مصنف پوسیدہ خوانندہ را تمام شد

اس کتاب میں مکمل حالات نہیں ہیں اور جس قدر ہیں وہ ایک محدود دائرے سے متعلق ہیں اس کا خط نستعلیق ہے اور یہ اچھی حالت میں ہے۔

چوتھا مخطوطہ عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں سعیدیہ کتب خانہ سے منتقل ہوا ہے اس کا ایکسیشن نمبر ۹۰/۴۹ ہے اس میں ۱۸۴ صفحات ہیں اور ہر صفحہ کی سطریں پندرہ ۱۵ ہیں۔ اس کا خط نستعلیق ہے یہ اچھی حالت میں اور مکمل ہے اس کا سائز ۱۵×۳۵ سینٹی میٹر ہے۔ اس پر دو مہریں ثبت ہیں۔ ایک مہر نواب وزیر خاں اور دوسری نواب محمد علی خاں کی کندہ ہے۔ اس مخطوطہ کے اول و آخر کی عبارت ملاحظہ ہو

اول :۔ اجزا ارچند مسمی چہار گلشن . . . .

آخر :۔ فقرا را اسلام تصنیف چتر من رائے قوم کایسته سکینہ

اس مخطوطہ میں بھی چار گلشن قائم کیے گئے ہیں اور ان میں وہی تفصیل درج ہے

جو کہ چہار گلشن محمد شاہی کے چاروں گلشنوں میں مذکور ہے۔ اس لیے اس کا اعادہ
لاحاصل ہے، ذیل میں سعیدیہ لائبریری ٹونک سے منتقل نسخہ کے بارے میں ضروری
باتیں تحریر کی جاتی ہیں۔

چہار گلشن یا اخبار النوادر ہندوستان کے اسلامی دور کی ایک اہم اور اپنی
نوعیت کی منفرد کتاب ہے، جس میں تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی
معاشرت، میلے ٹھیلے۔ رسم و رواج۔ آب و ہوا۔ مالگذاری، آمدنی اور زمین کی پیمائش
وغیرہ موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ کتاب وزیر غازی الدین کی خواہش پر احمد شاہ
ابدالی کے دہلی پر دوسرے حملے کے وقت فارسی زبان میں لکھی گئی، جو عربی فارسی ریسرچ
انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک کے غیر مطبوعہ تاریخی مخطوطات میں ایک اہم اور نادر و
کم یاب مخطوطہ ہے، اس میں ہندوستان کے قدیم دور سے مغلوں کے زمانے تک کے
حالات بیان کیے گئے ہیں، اس فارسی مخطوطہ کے مصنف رائے چتر من کالیستھ ہیں،
جنھوں نے ۱۱۷۳ھ میں اسے تصنیف کیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا،
ان کی وفات کے ۱۳ سال بعد ان کے پوتے رائے زادہ چندر بھان منشی کالیستھ نے
اس تاریخی دستاویز کو مرتب کرتے وقت اس میں ایک مقدمہ کا اضافہ کیا،

آنجہانی چتر من کالیستھ کا یہ تاریخی مخطوطہ ۱۸۴ صفحات پر مشتمل اور ان کی محنت و
جانفشانی کا نتیجہ ہے جو ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے یہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ مخطوطہ قدیم
ہندوستان سے مغلیہ سلطنت کے عہد تک کی معلومات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے
ہے۔ اس سے دہلی اور دکن کے سلاطین اور دہلی کے مختلف صوبوں کو جاننے والی

مختلف شاہراہوں اور منزلوں کے علاوہ ہند کے فقراء اور اس دور کے دوسرے
تاریخی معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف نے ہندوستان کے مختلف صوبوں کی
آمدنی، زمین کی پیمائش وغیرہ اس کتاب میں درج کر کے اس مخطوطہ کو دیگر مخطوطوں سے
ممتاز بنا دیا ہے۔ یہاں یہ لکھنا مناسب ہے کہ ان کے پوتے چندر بھان کالیستھ نے
اس کتاب کو مرتب کر کے ایک مفید علمی و تاریخی خدمت انجام دی ہے، اس کتاب میں
بھی چہار گلشن ہیں اور ان میں وہی معلومات درج ہیں جو چہار گلشن محمد شاہی کے
ضمن میں بیان کی جا چکی ہیں، اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے

مخطوطہ اگرچہ خط نستعلیق میں ہے لیکن اکثر عبارتوں کو پڑھنے میں دشواری کا
سامنا کرنا پڑتا ہے خصوصاً ہندی ناموں اور ہندی الفاظ کی صحت کو کاتب نے مدنظر نہیں
رکھا ہے، فارسی الفاظ میں بھی کہیں کہیں املا کی غلطیاں ہیں اور کہیں کہیں الفاظ ہی غلط
لکھے ہوئے ہیں مثلاً کتاب کے آغاز ہی کو لیجئے جہاں کاتب نے "مظہر دانش بنشیں" لفظ کو
"پس" لکھ دیا ہے اور بالکل واضح لکھا ہے اسی طرح آخری صفحہ پر احمد شاہ ابدالی کو
"ابا دالی" لکھ دیا گیا ہے۔

کاتب نے واقعات اور سلاطین کی پیدائش اور وفات اور جلوس وغیرہ کی
تاریخیں اور سنین بھی صحیح نہیں لکھے ہیں۔

جلد ساز نے کتاب کی اوراق بندی میں صفحوں کو آگے پیچھے کر دیا ہے مسلسل
عبارت پڑھتے ہوئے مضمون مبہم ہو جاتا ہے۔ اگر کاتب نے قدیم کتابت کے
اصول کے مطابق ترکہ کا استعمال نہیں کیا ہوتا تو صفحوں کی ترتیب اور ان کے تعین
میں بڑی دشواری پیش آتی۔

مخطوطہ کے اول دیباچہ میں مندرجۂ ذیل فرد سے سن تالیف ۱۲۰۷ھ نکالا گیا ہے۔

دائماً سیراب بادا چہار گلشن در جہاں

اور اس کے دوسرے دیباچہ میں مندرجۂ ذیل شعر کے مطابق سن تالیف ۱۱۷۳ھ نکلتا ہے اور کتاب کے تتمہ میں بھی یہی درج ہے مخطوطہ کے صفحہ ۳ پر سن تصنیف ۱۱۹۵ھ لکھا ہوا ہے غالباً اسی بنا پر لائبریری کی تفصیلی فہرست جو قصر علم کے نام سے شایع ہوئی ہے اس کے صفحہ نمبر ۱۵۹ پر بھی یہی سن تصنیف درج کر دیا گیا ہے مگر یہ غلط ہے اور تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ سن تصنیف ۱۱۷۳ھ ہی صحیح ہے۔

ز دل گفتم بگو تاریخ روشن   ندا آمد چتر من نیک گلشن

مصنف نے مخطوطہ میں جا بجا اسلامی مہینوں محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ اور کہیں کہیں ایرانی مہینوں۔ فروردین، اردی بہشت، خورداد، تیر، مرداد، شہریور، مہر، آبان، آذر، دی، بہمن اور اسفند کے نام لکھے ہیں، مصنف یا کاتب نے گلشن دوم اور سوم میں فصل نہیں قائم کی ہے بلکہ ان کو ایک دوسرے میں مخلوط کر دیا ہے اسلیئے ہر دو گلشن میں فرق و امتیاز کے لیے سیاق و سباق اور چہار گلشن محمد شاہی سے مدد لینی ضروری ہے احقر نے اس مخطوطہ کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا ہے اس میں گلشن دوم اور سوم کا تعین اسی طرح کیا ہے گلشن چہارم میں گرو نانک سے گرو گوبند تک جو دس گرو گذرے ہیں ان میں سکھوں کے گرو اور جن کے بعد ہونے والے گرو کا نام نہیں لکھا گیا ہے، گلشن اول میں جا بجا بیاض ہے، اسی طرح گلشن دوم میں سرخیاں چھوڑ دی

گئی ہیں جن کو چہار گلشن محمد شاہی سے تصحیح کے بعد ترجمہ میں درج کیا گیا ہے اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹونک کی سعیدیہ لائبریری کا یہ نسخہ سب میں اہم ہے جس کی وجہ اسکی مندرجۂ ذیل خصوصیات ہیں۔

۱۔ اس کے مصنف رائے چتر من کالستھ لقب رائے زادہ کے پوتے نے اسے ترتیب دیا ہے۔

۲۔ اس میں انھوں نے اپنی طرف سے ایک دیباچہ بھی شامل کیا ہے

۳۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ نسخہ قدیم ہے، صاحبزادہ شوکت علی خاں ڈائرکٹر عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ "قصر علم" کے صفحہ نمبر ۱۰۵ پر رقم طراز ہیں:-

"چہار گلشن کے خطی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں برٹش میوزیم میں انیسویں صدی عیسوی کا نسخہ ہے، انڈیا آفس لائبریری میں اٹھارہویں صدی عیسوی کا مکتوبہ ہے، بالڈون میں ۱۲۰۳ھ م ۱۷۸۹ء کا لکھا ہوا اور بانکی پور میں انیسویں صدی عیسوی کا اور کتب خانہ آصفیہ میں تیرہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔

ہمارے ادارہ میں نسخہ ہذا کی تاریخ کتاب میں درج نہیں ہے، لیکن یہ تیرہویں صدی ہجری کا مرقومہ معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس نسخہ پر نواب وزیر الدولہ بہادر خلد مکانی فرمانروائے دوم ٹونک (۱۸۳۴ء تا ۱۸۶۴ء) کی مہر ثبت ہے۔"

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ موجودہ دور کے حالات اور تقاضوں کے مطابق انسٹی ٹیوٹ نے فارسی مخطوطات کے ہندی ترجموں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا ہے اسی کے مطابق راقم نے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے زیر نگرانی مخطوطہ کا ترجمہ کیا ہے جو اس وقت تصحیح و مقابلہ کے مرحلے میں ہے اور انشاء اللہ عنقریب شایع ہوگا۔

اخبار علمیہ

ابو مظفر اسامہ بن المنقذ شیزری، چھٹی صدی ہجری کے ایک غیرت مند اور اولوالعزم صاحب سیف وعلم شخص تھے، گو وہ اہل قلم نہیں تھے تاہم کارزار حیات اور خاص طور پر میدان جنگ کی بعض یادوں کو انھوں نے سپاہیانہ صاف گوئی اور بے تکلفی کے ساتھ سپرد قلم کیا تھا، عرصہ تک ان کی یہ تحریر کتب خانوں کی زینت رہی، ۱۸۸۴ء میں پہلی بار، کتاب الاعتبار کے نام سے یہ لیڈن سے شایع ہوئی، اس کے بعد فرانسیسی، جرمن اور انگریزی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا، اب شام کے مشہور عالم شیخ عبدالفتاح ابو غدہ نے تحقیق وتعلیق کے بعد صاحب تاریخ دعوت وعزیمت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ اسے شایع کیا ہے، جریدہ الرائد کے ادبی ایڈیشن، الادب الاسلامی، نے مولانا کا یہ مقدمہ نقل کیا ہے، اس کے پڑھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ شجاعت وحمیت کی اس داستان پارینہ سے اردو دنیا بھی محروم نہ رہے۔

میدان جنگ کے واقعات ومشاہدات قلمبند کرنے کی روایت آج بھی قائم ہے گذشتہ دنوں دہلی میں ہندوستانی حربیات کے ایک اہم مصنف کرنل گوتم شرما کی نئی کتاب VOLOUR AND SACRIFICE کی رسم اجرا ہوئی، اس کتاب میں ہندوستانی فوج کی چند مشہور رجمنٹوں کا تفصیل سے جائزہ لے کر ان کی

شجاعت وقربانی کی کہانیوں کو وثوق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، کتاب میں اس نظریہ کو مہمل بتایا گیا ہے کہ چند خاص قومیں ہی جنگ جویانہ صلاحیت رکھتی ہیں، یہ محض برطانوی استعمار کا پروپیگنڈہ تھا، اس دعوی کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ آزادی کے بعد اگر ہندوستانی فوج میں برطانوی آفیسر اور شمال مغربی ہند کی بعض جنگ جو (گورکھا) قومیں نہ ہوتیں تو ہندوستان طوائف الملوکی کا شکار ہو جاتا، رسم اجراء کے موقع پر ممتاز مورخ پروفیسر بپن چندر اور دوسرے ماہرین نے حکومت کی نکتہ چینی کی کہ اس نے ۶۲ء کی ہند چین اور ۶۵ء کی ہند پاک جنگ سے متعلق دستاویزوں اور جنگی روزنامچوں کو محققوں اور اسکالروں کی دسترس سے دور رکھا ہے، جس کی وجہ سے ان دونوں جنگوں کے اسباب وعوامل وواقعات کے صحیح تجزیہ میں مشکلات حائل ہیں، حالانکہ مغربی ممالک خاص طور پر امریکہ اور برطانیہ میں یہ دستور ہے کہ حربی روزنامچے اور دستاویزیں تیس برس کے بعد (De-classitied) ہو جاتی ہیں، لیکن ہندوستان میں ایسا کوئی قانون نہیں، کرنل گوتم شرما نے اعتراف کیا کہ اصل روزنامچوں اور دوسرے ماخذ کے نہ ملنے کی وجہ سے ان کی یہ کتاب مجمل ہے، تاہم اس میں ریٹائرڈ جنرلوں، فوجی آفیسروں اور دوسرے سپاہیوں کی یادداشت اور ان کی ذاتی ڈائریوں سے مدد لی گئی ہے۔

آپ بیتی اور ذاتی ڈائری، احساسات ومشاہدات کے بے تکلف اور بے کم وکاست بیان کا کامیاب ادبی وسیلہ ہیں، اسی قسم کی آپ بیتی روس کے مشہور کمیونسٹ لیڈر بورس یالٹسن کی ہے، جو روس کے موجودہ صدر گورباچوف کے خاص حریف اور عوامی مقبولیت میں ان سے فائق ہی ہیں، یہ آپ بیتی AGAINST THE GRAIN کے نام سے شایع ہوئی ہے، روسی کمیونسٹ پارٹی کے بلند مقام وصاحب منصب ارکان

کے متعلق یہ مشہور ہے کہ مارکسزم کے بارے میں ان کا مطالعہ وعلم حد درجہ سطحی ہے، اس کا ثبوت بورس پالٹسن کی مذکورہ کتاب سے بھی ملتا ہے، انھوں نے بڑے دلچسپ پیرایہ میں اپنا واقعہ بیان کیا کہ جب کمیونسٹ پارٹی میں داخلہ کے لیے ان کا ٹسٹ لیا جارہا تھا تو ایک ممتحن نے ان سے داس کیپٹل میں تجارت اور سرمایہ کے باہمی ربط پر مارکس کے خیالات دریافت کیے کہ وہ کس جلد اور کس صفحہ پر ہیں، بقول پالٹسن مارکس کے متعلق ان کی معلومات صفر کے برابر تھیں، لیکن انھوں نے ممتحن کے بارے میں بھی یہی تصور کرکے فوراً جواب دیا کہ جلد دوم میں صفحہ ۳۸۷ پر، پالٹسن کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ممتحن ان کے برجستہ جواب سے متاثر ہوا، تعریف کی اور کمیونسٹ پارٹی میں ان کو شامل کرلیا، جس فلسفی اور فلسفہ کو کمیونسٹوں نے اپنا عقیدہ وایمان بنایا اسکے مطالعہ سے تغافل کا یہ سلسلہ اسٹالن کے عہد ہی سے شروع ہوگیا تھا، چنانچہ ایک میٹنگ میں جب اسٹالن مارکس کے ایک نظریہ کی غلط ترجمانی کررہا تھا تو عین اسی وقت مارکس اینجلز انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈیوڈ ریاضونوف نے اسٹالن کو ٹوک دیا، لیکن نشہ قوت صداقت اور واقعیت کو کب خاطر میں لاتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ریاضونوف کو اپنی زندگی ہی سے ہاتھ دھونا پڑا۔

نشہ طاقت واقتدار کی خطرناکی، صاحب نظروں سے کبھی پوشیدہ نہیں رہی، اسکی موجودہ واضح ترین مثال بابری مسجد کا تنازعہ ہے، ارباب سیاست، پیشوایان مذہب اور پرستاران دولت وثروت کی آوازوں سے پورے ملک میں ایک شور بپا ہے، عجب عجب آوازیں بلند ہوتی ہیں، حال ہی میں ٹائمز آف انڈیا میں بمبئی کے ایک صاحب مسٹر والٹر ڈی مین سکس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بابری مسجد، نابیناؤں کی نیشنل ایسوسی ایشن کے سپرد کردی جائے، لکھنؤ کے ڈی، پی مشرا نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا کہ "جو مذہب، انسانیت کی تحقیر کرے وہ درحقیقت مذہب ہی نہیں ہے، پنڈت پروہت، لیڈر، دانشور اور انسان دوست افراد کو کھلے دل کے ساتھ اس نازک قومی مسئلہ پر غور کرنا چاہیے، اگر یہ مقدس عمارت نابیناؤں کے لیے خاص کردی جائے تو دنیا کیلئے

عمدہ مثال ہوگی اور اس سے بے ضرورت فرقہ وارانہ کشیدگی کا خاتمہ بھی ہوجائے گا"۔

آزادروخیالات کی ستم ظریفی سے قطع نظر، سنجیدہ اہل فکر ونظر نے ہمیشہ اصل مرض کی تشخیص کی ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے آج سے تقریباً ستر برس پہلے معارف کے شذرات میں لکھا تھا کہ ..... جو کچھ اس وقت ہورہا ہے وہ تلافی مافات نہیں بلکہ سابق کی انتقام طلبی کے مظاہر ہیں اور اس طرح قیامت تک ہندو مسلم اتحاد کی عمارت کی تعمیر نہیں ہوسکتی، اسکی تعمیر کی صرف ایک صورت ہے کہ گذشتہ عہد کی فاتح ومفتوح دونوں قومیں ..... پرانے جذبات کو فراموش کریں اور نئے عہد کے نئے جذبات کا آغاز کریں" حضرت سید صاحبؒ کے یہ ارشادات آج بھی کس قدر قیمتی ہیں، یہ دارالمصنفین کی نئی کتاب 'شذرات سلیمانی' میں جمع کردیے گئے ہیں،

جامعہ ازہر کا علمی ودینی ترجمان مجلۃ الازہر، گو ایک زمانہ سے شایع ہورہا ہے، تاہم اسکے جولائی اور اگست کے شمارے ہماری نظر سے پہلی بار گزرے، مضامین خاصے ہیں اور سب کے سب علمی ودینی رنگ میں ہیں، ایران کے زلزلہ میں مصر وعراق کی مدد کے متعلق شیخ الازہر امام جاد الحق علی جاد الحق کا ایک بیان بھی ہے جس میں انھوں نے ایران کے مصیبت زدہ افراد کی مدد کیلئے عربوں کے رویہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا "یہ باعث مسرت وخیر ہے اور اخلاق اسلامی کے عین مطابق ہے، اور امید ہے کہ اسلامی اتحاد وہمدردی کا یہ جذبہ مسلمان قائدین حکومت میں اور مضبوط ہوگا" مگر افسوس کہ چند دنوں کے بعد ہی شیخ الازہر کی یہ توقعات کس درجہ حسرت ویاس میں بدلی ہوں گی، جب کویت پر عراق کے حملہ کے بعد تمام عالم عرب نے خود ہی اتحاد، تعاون، خیر خواہی، ہمدردی اور اخلاق اسلامی کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنی اور عالم اسلام کی شرمساری اور نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ کی خواری کا سامان فراہم کردیا، حکیم مطلق کی حکمت ومشیئت میں کسے دخل ہے، لیکن زبان پر شکوہ آہی جاتا ہے۔

اگر ایں است رسم دوستداری بدیوار حرم زن جام ومینا

"ع۔ص"

معارف کی ڈاک

(۱)

لکھنؤ، ۲۹ اگست ۹۰ء

مدیر محترم، سلام مسنون

نئی حکومت کے قیام اور میرے وزیر ہونے کے بعد سے فرقہ پرست سیاست اور تنگ نظر صحافت نے جس طرح میرا محاصرہ کیا ہے اس سے آپ واقف ہی ہوں گے۔ یہ سلسلہ یہانتک دراز ہوا کہ غیروں کے ساتھ اپنوں نے بھی یا تو کسی غلط فہمی کی بنا پر یا پھر کسی سازش کا شکار ہو کر مجھے نقصان پہنچانا چاہا اور پہنچایا بھی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہی رہی۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ملّی معاملات میں میں نے آج تک کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ ہی اس سلسلہ میں کبھی کسی سیاسی شعبدے بازی کا مظاہرہ کیا لیکن اسکے باوجود قومی اخبارات و رسائل نے جس طرح مجھے بدنام کرنے اور میری کردار کشی کی کوشش کی ہے اس سے میرے تئیں ان کے دل میں جو نفرت ہے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس امتحان کی گھڑی میں جب میرے اوپر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ آپ نے میری ہمت افزائی کی ہے۔

یہ درست ہے کہ ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جو مجھکو کسی بھی طور پر برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ میں نے نہ تو اپنا راستہ بدلا ہے اور نہ بدلونگا۔ میں آپ سے بھی امید کرتا ہوں کہ اصولوں کی سیاست کو عزیز رکھنے کی بنا پر آپ کا تعاون میرے ساتھ مستقبل میں بھی جاری رہے گا اور اسی امید میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں گو کہ اس میں

کچھ تاخیر ہو گئی ہے۔ لیکن پھر بھی توقع ہے کہ آپ کی اخلاقی مدد اور دعائیں میرے شامل حال رہیں گی۔ آپنے مجھ سے جو امید وابستہ کر رکھی ہے انشاء اللہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ ممکن ہے کہ میرے اور آپ کے سیاسی نظریات میں فرق ہو لیکن آپ میری نیت میں کبھی کوئی کھوٹ نہیں پائیں گے۔

نیازمند
محمد اعظم خاں

(۲)

۴ ستمبر ۹۰ء۔ محلہ دیوان، نابھا، پنجاب،

ضیاء الدین اصلاحی صاحب! آداب۔

یوگ وششٹھ پر ایک مضمون اور فہرستیں ارسال خدمت ہیں۔ شایع فرمائیں۔

مجھے علی جواد زیدی صاحب نے ایک خط میں لکھا ہے "آپنے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آنکھیں کھول دیں کاش میری یہ کاوشیں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ادبی محاذ پر ایک صف میں کھڑا کر دیں۔

میں دہلی سے آگے صرف لکھنؤ اور بمبئی گیا ہوں دو دو دن ٹھہرا تھا۔ اسلیئے کسی لائبریری میں نہیں جا سکا۔ عربی میں ایک اور رامائن اور فارسی اردو میں کئی رامائنوں کا اور پتہ چل گیا ہے ساہتیہ اکادمی دہلی والوں نے مکمل BIBLOGRAPHY رامائنوں عربی۔ فارسی۔ اردو کی منگوائی ہے۔

موریشش میں رامائن میلہ لگا تھا۔ ہر سال لگتا ہے۔ شاید INDIAN CULTURAL دہلی والوں نے بھی کوئی تقریب منائی تھی۔ مجھے کسی نے نہیں بلایا۔ عربی۔ فارسی۔ اردو کو کوئی جانتے تبھی تو بلائیں۔ انہیں کیا پتہ کہ جو کھوج میں نے کی ہے وہ پہلے کسی نے نہیں کی۔

گیتا کے نقشے تیار ہو رہے ہیں۔ تہلکہ مچانے والے ہونگے۔ لیکن ایک ماہ تک یہ کام بند رہیگا۔ آپ دیکھیں گے مسلمانوں نے عربی۔ فارسی۔ اردو تینوں میں کتنا کام کیا ہے۔

دو مضامین ایسے تیار کیے ہیں جو بالکل نئے ہیں۔ گو بند پرشاد فضا لکھنوی کی آٹھ کتابیں تلاش کیں۔ ۲۰۰ سال پرانی۔ مضمون نیا دور کو بھیجدیا۔ طوطارام شایاں کی ۲۰۰، ۱ سال پرانی ۱۲ کتابوں کا پتہ لیا۔ یہ کتاب ساہتیہ اکادمی والوں کیلئے لکھ رہا ہوں۔

نیازمند
رام لعل نابھوی۔

مطبوعات جدیدہ

اقبال اکادمی پاکستان کی کتابیں

کئی برس پہلے علامہ اقبال کے افکار و خیالات کی اشاعت کے لیے اقبال اکادمی پاکستان لاہور کا قیام عمل میں آیا تھا، اس کی جانب سے اردو اور انگریزی میں دو سہ ماہی رسالے چھپتے ہیں جو علامہ پر محققانہ مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں، ہر سال اکادمی اقبال پر معیاری اور عالمانہ کتابیں بھی شایع کرتی ہے ذیل میں ان کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے۔ ان کو اکادمی کے دفتر ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور، پاکستان سے حاصل کیا جا سکتا ہے، ہر کتاب میں مختلف اشاریے دیئے گئے ہیں جن سے مراجعت میں سہولت ہوتی ہے، البتہ املا وغیرہ کی غلطیاں ہیں جو سہو کتابت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔

طواسین اقبال جلد دوم و سوم مرتبہ جناب ایس۔ ایم۔ عمر فاروق مرحوم

متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۲۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۱۰ روپے۔

یہ ایک عالمانہ اور اہم کتاب ہے جو اقبال کے فلسفیانہ نظریات و افکار پر مضامین کا مجموعہ ہے اس کا پہلا حصہ اس سے قبل طبع ہو چکا ہے، زیر نظر کتاب اس کے دوسرے اور تیسرے حصوں پر مشتمل ہے، دوسرے حصہ میں ریڈیائی اور اقبال ڈے کی تقریریں درج ہیں، اس میں اقبال کے خطبات کی روشنی میں ان کے متعدد افکار و خیالات کی

وضاحت کی گئی ہے، تقریریں مختصر ہونے کے باوجود پُر مغز ہیں، چند عنوانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ اقبال کا فلسفۂ خیر و شر، اقبال اور ذات باری کا تصور، قرآن اور خودی، قرآن اور زمانہ، فکر اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ پر ایک نظر، جمال الدین افغانی اور اقبال، اقبال کی نظر میں اجتہاد کی اہمیت، اقبال اور ابن رشد، اقبال اور بہشت، اسلامی ثقافت کی روح، اقبال اور حضرت مجدد الف ثانیؒ، اقبال اور قصۂ ہبوط آدم کی حقیقت وغیرہ، شروع میں ایک مفید مقدمہ ہے، اس میں خطبات اقبال کے کئی اہم پہلوؤں کا ذکر ہے، تیسرے حصہ میں اقبال اور افلاطون کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے جس میں افلاطون کی کتاب الجمہوریہ اور اسرار خودی و رموز بے خودی کے حوالے سے دونوں کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں ابدیت، فلسفہ ریاست، عدل، سیاست و نظام سلطنت جمہوریت، فرد و ملت، فنون لطیفہ، اشتراکیت اور نظام تعلیم و تربیت جیسے مسائل زیر بحث آئے ہیں اور ان کے بارے میں افلاطون اور اقبال کے تصورات و خیالات واضح کیے گئے ہیں۔ مطالعہ کے بعد ہی اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا، اور اقبال کے فکر و نظر کی وسعت و ہمہ گیری کی طرح مصنف کے علم و مطالعہ کی وسعت کا پتہ چلے گا۔

اقبال کا تصور بقائے دوام مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۳۴ مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت ۸۰ روپے۔

فلسفہ و الہیات مصنف کا اصل موضوع ہے اور وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے لائق استاذ ہیں، علامہ اقبال بھی اصلاً فلسفی تھے اس لیے ان کے فکر و فلسفہ کو بھی مصنف نے اپنے مطالعہ و تحقیق کا موضوع بنایا ہے، اس کتاب میں انھوں نے حیات

بعد الموت اور روح کے بقائے دوام کے مسئلہ پر اقبال کے تصور اور فلسفیانہ نظریے کو واضح انداز میں پیش کیا ہے، یہ کتاب اصلاً چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے انھوں نے موت کے مسئلہ پر بحث کرکے اس کی فلسفیانہ سرگذشت سنائی ہے اور بتایا ہے کہ قدیم و جدید فلسفہ میں اس پر خاطر خواہ بحث و گفتگو نہیں کی گئی ہے پھر وہ بقائے دوام کے مسئلہ کی وضاحت اور اس کی سرگذشت پیش کرکے اس کے بارے میں رد و قبول پر مبنی اقوال و دلائل کا جائزہ لیتے ہیں، تیسرے باب میں وہ فکر اقبال کی اصل نوعیت اور اس کا مخصوص طریق کار وجدان کو بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی اہمیت پر زور دینے سے عقل کا استعمال متروک نہیں ہوتا۔ اس کے بعد کے دو ابواب اقبال کے تصور بقائے دوام کے فکری پس منظر کے بیان کے لیے مخصوص ہیں، پہلے ان مغربی مفکرین کے تصورات کا جائزہ لیا ہے جن پر اقبال نے تنقید کی ہے یا جن سے وہ بالواسطہ متاثر ہوئے ہیں اور آخر میں ان اثرات کا ذکر ہے جو مشرقی ماخذ سے ان پر مترتب ہوئے ہیں، ان ماخذ کا اصل سرچشمہ اسلامی تعلیمات اور رومی کے افکار کو بتایا گیا ہے، اسی ضمن میں علامہ ابن رشد وغیرہ کا ذکر بھی آیا ہے، چھٹے باب میں اقبال کا تصور بقائے دوام زیر بحث آیا ہے، ان کے بیان کے مطابق اقبال کے نزدیک آخرت کی زندگی کے ایقان کا مصدر و منبع فلسفیانہ نظریات کے بجائے ایمان ہے تاہم وہ عقلی و نظری سطح پر اس سے تعرض کیے جانے کے مخالف نہیں ہیں، آخر میں فرہنگ اصطلاحات کے عنوان سے اصطلاحی لفظوں کے مترادف انگریزی الفاظ دیے گئے ہیں، علامہ اقبال کے مختلف پہلوؤں پر بہت لکھا جاچکا ہے، لیکن اس مسئلہ پر اس قدر تفصیل سے کم بحث کی گئی ہے، اس اعتبار سے یہ اہم کتاب ہے، مصنف نے اقبال کے نظریات کو ثابت کرنے کے لیے انکی شاعری

سے کم اور ان کے خطبات سے زیادہ مدد لی ہے، "خلود" کی بحث میں سیرۃ النبی جلد چہارم از مولانا سید سلیمان ندوی کے حوالے دیئے گئے ہیں اور اسے ان کے استاذ مولانا شبلی کی تصنیف بتایا ہے جو غلط ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سیرت کا کوئی قدیم ایڈیشن مصنف کے پیش نظر رہا ہے، جن مسائل سے مولانا سید سلیمان ندوی نے رجوع کرلیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے۔

اقبال ۸۵ء مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۱۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۰۰ روپیہ۔

یہ کتاب اصلاً ان مضامین کا انتخاب ہے جو علامہ اقبال پر ۸۵ء میں لکھے گئے اور اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوئے، ان کی تعداد ۷۲ ہے، مگر شروع میں ۸۵ء میں لکھے گئے مضامین کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے جن میں ۹۷ مضامین کا ذکر ہے جو مضامین انتخاب میں نہیں آسکے ہیں ان کی تلخیص آخر میں دی گئی ہے تاکہ ان کے محتویات کا اندازہ بھی قارئین کو ہوجائے۔ منتخب مضامین کو ان پرکشش عنوانات کے تحت سلیقہ سے جمع کیا گیا ہے، حیات و سوانح، شخصیات، شعریات، فکریات، سیاسیات، پاکستانیات، تصورات اور متفرقات گو سب مضامین ایک سطح کے نہیں ہیں تاہم اکثر مفید اور قابل مطالعہ ہیں، اس کتاب سے معلوم ہوا کہ ۸۶ء میں بھی اقبال پر لکھے جانے والے مضامین کی فہرست و انتخاب اکادمی نے شایع کی تھی اور منصوبہ کے مطابق ۸۵ء کے بعد کے برسوں میں بھی شایع کیے ہوں گے مگر یہ سب جلدیں ہماری نظر سے نہیں گذریں۔ اکادمی کا یہ اقدام مفید، لایق تحسین اور منفرد ہے، اس سے اقبال کی مقبولیت کے علاوہ ان پر ہونے والے سالانہ کاموں کا خاکہ سامنے آجاتا ہے، لیکن فہرست مضامین

سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر و بیشتر مضامین کا تعلق لاہور ہی سے ہے، غالباً ایک ایک ہی مضمون کراچی اور حیدرآباد (ہندوستان) کے ہیں، ممکن ہے ہندوستانی رسائل تک دسترس نہ ہوئی ہو لیکن پاکستانی اخبار و رسائل تک دسترس نہ ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، فہرست و انتخاب میں مکمل نمائندگی ہونی چاہیے اور مقامی اثر کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔

اقبال بحیثیت مفکر پاکستان مرتبہ ڈاکٹر عبدالحمید، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۹۸، مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت ۴۵ روپیے۔

ڈاکٹر اقبال کو اس صدی کا سب سے بڑا شاعر کہا جاتا ہے، جن کی شاعری کو برصغیر ہند و پاک میں غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی، ان کی شاعری اصلاً درس و پیام تھی جو آج بھی فکر و عمل کی دعوت دیتی ہے مگر وہ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک بڑے فلسفی و مفکر بھی تھے اور ان کے دل میں اپنی قوم و ملت اور ملک و وطن کا بڑا درد تھا، پاکستان کو انہی کے ذہن کی پیداوار بتایا جاتا ہے، اس صدی کے اوائل میں انھوں نے ملک و قوم کے اکثر مسائل کے بارے میں جن احساسات و خیالات کا اظہار کیا تھا اس کتاب میں ان کو مناسب ترتیب اور اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس سے اس عہد کی قومی، ملی اور سیاسی تاریخ بھی سامنے آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں کے اہم مسائل کیا تھے اور ان کو حل کرنے کی کیا تدبیریں اختیار کی گئیں، مغربی تعلیم، مغربی جمہوریت، مسلم قومیت، دنیائے اسلام اور اس زمانہ کی تحریکوں کانگریس، مسلم لیگ اور تحریک خلافت نیز ان کے قائدین کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے احساسات کیا تھے؟ کتاب لائق مطالعہ ہے مگر مصنف پاکستانی ہیں اور انھوں نے اسی انداز سے مسائل کا تذکرہ کیا ہے جن سے ہندوستان کے

ارباب قلم کو مکمل اتفاق نہیں ہو سکتا۔

نفائس اقبال مرتبہ جناب شیما مجید، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۸۲ مجلد مع گردپوش، قیمت ۸۰ روپیے

جناب سید عابد علی عابد مرحوم ایک اچھے شاعر اور مشہور اہل قلم تھے جو اقبال شناسی میں بھی ممتاز تھے ان کو علامہ اقبال سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا تھا، اس کتاب میں ان کے ان مضامین کو جمع کیا گیا ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اقبال کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں لکھے تھے، پہلے مضمون میں ڈاکٹر صاحب سے اپنی دو ملاقاتوں کا حال بیان کیا ہے دو مضامین میں شکوہ اور جواب شکوہ کا تجزیہ کیا ہے، اقبال اور مقام رسالت بھی اہم مضمون ہے، اس سے ڈاکٹر صاحب اور مضمون نگار دونوں کی ملی حمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اقبال کے کلام میں مطابقتِ الفاظ و معانی اور کلام اقبال میں لالہ کی علامتی حیثیت قابلِ توجہ اور لائق مطالعہ مضامین ہیں۔ اول الذکر مضمون میں علامہ شبلیؒ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ قلت تدبر کا نتیجہ ہے، اقبال اور فنون لطیفہ میں آرٹ کے متعلق اقبال کا نظریہ پیش کیا ہے، آخری مضمون "ابلیس کی مجلس شوریٰ" سے مصنف کی تنقیدی بصیرت اور تحلیل و تجزیہ کی خوبی کا پتہ چلتا ہے، بابا طاہر اور اقبال کے موضوع پر غالباً پہلی مرتبہ اس قدر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اس میں بابا طاہر کے حالات و کمالات تحریر کرکے اقبال پر ان کے اثرات دکھائے ہیں، شروع میں اقبال اکادمی کے سابق ناظم پروفیسر محمد منور کا افتتاحیہ خاصے کی چیز ہے، جناب شیما مجید کے قلم سے سید عابد علی عابد کے مشاغل و تصانیف کا تذکرہ بھی ہے۔

سلسلۂ درسیات اقبال جلد اول۔ دوم۔ سوم } مرتبہ پروفیسر سید عبدالرشید فاضل تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۰، مجلد

مع گرد پوش، قیمت ۹۰ روپیے۔

یہ کتاب درسی انداز میں لکھی گئی ہے اور تین جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد میں اقبال کی سبق آموز نظمیں شامل کی گئی ہیں اور ان کا مفہوم و مطلب بتایا گیا ہے، مشکل لفظوں کے معنی اور مشقی سوالات بھی دیئے گئے ہیں، کچھ نظمیں اقبال کی فارسی کتابوں سے ماخوذ ہیں لیکن ان کے اشعار نہیں دیئے گئے ہیں، صرف ان کا مفہوم و مدعا اور خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے، کہیں کہیں علامہ کے لطائف و ظرائف اور بعض خاص اشعار بھی درج ہیں، دو ایک مکالمے بھی ہیں، ان میں بھی علامہ کے اشعار کے مطلب و منشا کو واضح کیا گیا ہے، شروع میں ان کا مختصر سوانحی تذکرہ بھی ہے، جلد دوم کے مشمولات بھی اسی نوعیت و انداز کے ہیں، تیسری جلد کے پہلے حصہ میں نثر اور دوسرے میں نظم کا انتخاب ہے، حصہ اول میں ڈاکٹر صاحب کے خطوط اور دیباچے درج ہیں اور حصہ دوم میں غزلیں، قطعات، رباعیات اور نظمیں شامل ہیں۔ دونوں حصوں کے شروع میں اقبال کی نثر نگاری اور شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے، آخر میں اقبال کے چار پسندیدہ لفظوں شاہین، غازی، مومن اور زندگی کی دلچسپ اور معنی خیز تشریح و وضاحت کی گئی ہے، اس کتاب سے نئی نسلوں اور بچوں میں اقبال فہمی کا ذوق اور ان کی اسلامی و ایمانی اور اخلاقی تعلیم پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا، یہ اپنے طرز کی نرالی کتاب ہے، اس سے چھوٹے بچے اور کم استعداد کے لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اقبال اور عالمی ادب مرتبہ ڈاکٹر عبد المغنی تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۶۰۷ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۴۰ روپیے۔

ڈاکٹر عبد المغنی اردو کے محقق اور مشہور نقاد ہیں، انھوں نے اقبال کی شاعری کا مطالعہ بڑی دقت نظر سے کیا ہے اور وہ اپنے وسیع مطالعہ و تجربہ کی بنا پر اقبال کے

شیدائی اور عظمت شناس ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ان کے ہم وطن مشہور نقاد کلیم الدین احمد صاحب کو عام اردو شاعری کی طرح اقبال کے کلام میں بھی ہزاروں مین میخ نظر آتے ہیں جس کے نمونے ان کے مضمون "اقبال اور عالمی ادب" اور ان کی تصنیف "اقبال ایک مطالعہ" میں دیکھے جاسکتے ہیں، ڈاکٹر عبد المغنی کی یہ تصنیف لطیف ان دونوں کا مدلل جواب ہے، اس میں عالمی ادب میں اقبال کا ممتاز درجہ بتایا گیا ہے، اس مجموعہ کا ایک طویل اور اہم مقالہ "دانتے اور اقبال" ہے اس سے اور ملٹن سے موازنہ کر کے بھی اقبال کی اہمیت واضح کی گئی ہے، اس مجموعہ کے تمام مضامین اہمیت کے حامل اور توجہ کے مستحق ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی عام تحریروں کی طرح اس کتاب میں بھی ممدوح کی مداحی اور حریف کی نکتہ چینی میں غلو اور مبالغہ پایا جاتا ہے، ان کا تحکمانہ لہجہ اور مدعیانہ انداز بھی گراں گذرتا ہے۔

اقبال کا نظام فن: صفحات ۵۱۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲۵ روپیے۔

یہ کتاب بھی ڈاکٹر عبد المغنی کے خامہ زود نویس کی ایک اچھی دین اور اقبالیات پر ان کی گہری مبصرانہ نظر کا ثبوت ہے، اس میں انکی منظوم تصانیف کے حصہ اردو پر سیر حاصل بحث و تبصرہ ہے، اس پر جناب سید صباح الدین عبد الرحمان مرحوم کے قلم سے معارف میں مبسوط تبصرہ شایع ہو چکا ہے۔

من اے میر امم واداز تو خواہم مرتبہ ڈاکٹر غلام علی چودھری صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۲۸ مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت ۴۰ روپیے۔

پاکستان ہی نہیں ہندوستان اور اسلامی دنیا میں ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کے افکار و خیالات کی عظمت و اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ چاہے پاکستانی حکمرانوں کو ان کے

نظریات سے عملاً سروکار نہ رہا ہو مگر وہ محمد علی جناح کی طرح ان کی عقیدت و محبت کا دم بھرتے رہے ہیں، لیکن اس کے برعکس آزاد کشمیر کے حکمراں سردار عبدالقیوم نے ان کی ذات پر نارواطعن و تشنیع کی ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ان کے کلام سے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا اثر سلب کرلیا ہے، وہ بداعمالیوں کے مرتکب تھے، ان کے احباب و رفقا اچھے نہ تھے یہ لوگ ارکانِ اسلام نماز روزہ وغیرہ کا تمسخر کرتے تھے، اس کتاب میں سردار صاحب کے انھی ہفوات کا جواب دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ نہ صرف اس برصغیر بلکہ دنیائے اسلام میں اقبال کی شاعری کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور متدین علما کو اس میں زیغ و ضلال کے بجائے اسلامی حقائق و تعلیمات کا مرقع دکھائی دیتا ہے، اس کتاب سے جہاں اقبال اور ان کی فکر کی عظمت واہمیت معلوم ہوتی ہے وہاں سردار صاحب کی یاوہ گوئی اور افترا کا پردہ بھی چاک ہوجاتا ہے، البتہ خود مصنف کا لب و لہجہ تندی اور تلخی سے خالی نہیں۔

کتابیں ملیں

شیخ احمد کھٹوؒ از ڈاکٹر محمد اسلم استاد شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور تقطیع متوسط، کاغذ بہتر، طباعت ٹائپ، صفحات ۲۸، قیمت تحریر نہیں، پتہ ندوۃ المصنفین اسلام آباد، لاہور، پاکستان۔

اسلامی خلفاء و ملوک اور تاریخ اسلام سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ مرتبہ حافظ صلاح الدین یوسف صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۶۶، قیمت درج نہیں، پتہ دارالدعوۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، پاکستان۔

"ض"